حیدرآباد کے بنسی راجہ
راجہ گردھاری پرشاد باقیؔ
کی
حیات اور کارنامے

مصنفہ

ڈاکٹر بھاسکر راج سکسینہ

HYDERABAD KE BANSI RAJA

RAJA GIRDHARI PRASHAD BAQI

KE

HAYAT AUR KARNAME

Dr. Bhasker Raj Saxena

سرورق: ایم۔اے۔رحیم

کتابت: کمپیوٹر کمپوزنگ: ممتاز جہاں بیگم

طباعت: اسپیڈ پرنٹس سعید آباد۔ حیدرآباد 500059

فون 4063538

طبع اول: مئی ۱۹۹۵ء

تعداد اشاعت: ۵۰۰

قیمت: ۱۰۰ روپے

ناشر: مکتبہ شعر و حکمت۔ حیدرآباد

ملنے کے پتے

- مکتبہ شعر و حکمت ۲/ ۱۵۹-۳-۶ کپاڈیہ لین، حیدرآباد ۵۰۰۰۰۴
- حسامی بک ڈپو، مچھلی کمان حیدرآباد، ۵۰۰۰۰۲
- مصنف، آونتی نگر، حیدرآباد ۵۰۰۰۲۹ فون نمبر 241414

یہ کتاب آندھرا پردیش اردو اکیڈیمی کی جزوی اعانت سے شائع ہوئی۔

شبیہ راجہ گردھاری پرشاد باقی

المعروف "بنسی راجہ" محبوب نواز ونت

بشکریہ راجہ دین دیال (فوٹو ۱۸۹۱ء میں لی گئی)

انتساب

رانی گجراوتی (دختر نیک اختر بنسی راجہ) کے نام
جنھوں نے اپنی فیاضی ایثار اور خلوص سے کتنی ہی بجھتی
ہوئی زندگیوں کے چراغ روشن رکھے۔

فہرست مضامین

۱۔	دیباچہ	ڈاکٹر بھاسکر راج سکسینہ	5
۲۔	پیش لفظ	ڈاکٹر جعفر نظام سابق وائس چانسلر کاکتیہ یونیورسٹی	۱۲
۳۔	تعارف مصنف	جناب مضطر مجاز	۱۴
۴۔	آبا و اجداد، حالات زندگی		۲۰
۵۔	تہذیبی و ادبی ماحول		۳۳
۶۔	بنسی راجہ کی شخصیت		۳۶
۷۔	مملکت آصفیہ کی فوجی تنظیم اور کارخانہ جات کے قیام میں بنسی راجہ کا رول		۴۸
۸۔	توشۂ عاقبت۔ (سفرنامے)		۵۵
۹۔	باقیؔ بہ حیثیت شاعر		۷۲
۱۰۔	انتخاب کلام		۷۷
۱۱۔	فہرست تصانیف حضرت باقیؔ		۱۰۶
۱۲۔	کتابیات		۱۰۸

دیباچہ

بنسی راجہ کے تعلق سے سرمہاراجہ کشن پرشاد نے کہا تھا " راجہ گردھاری پرشاد ان چند اہل کمال و زندہ جاوید ہستیوں میں سے ایک تھے جو ایک نیک، خلق و مروت، سخاوت، شجاعت، رحمدلی، بے تعصبی، نیک نیتی، کریم النفسی، آشنا پرستی، انکساری، ملک کی خیر خواہی اور اپنے رہنما (آقا) سے بے انتہا عقیدت، تواضع و فروتنی جیسی صفات کے لئے اپنی مثال آپ تھے "۔

گردھاری پرشاد باقی کے شاد ہم عصر تھے۔

بنسی راجہ کا لقب انھیں نظام میر محبوب علی خاں نے دیا تھا۔ وہ اس لیے کہ بنسی راجہ نوجوان محبوب علی خاں کے بہت چہیتے اور قابل اعتماد درباری تھے اس تعلق سے دوارکا پرشاد افق لکھنوی اپنی تصنیف حیات باقی میں اسطرح رقمطراز ہیں۔

خطابش بنسی راجہ از نظام است * باوصاف حمیدہ نیک نام است

بنسی راجہ اعلیٰ منتظم، مردم شناس، سنجیدہ اور ذمہ دار شخصیت کے مالک تھے۔ اسی لئے نواب سالار جنگ اول نے انھیں شاہی محلات کی تمام تقریبات، اندرونی و بیرونی معاملات اور ہر قسم کا انتظام ان کے سپرد کیا تھا۔ نواب محبوب علی خان کی کم سنی کے دوران وہ ان سب امور کا خود ہی انتظام کرتے اور راست نواب سالار جنگ کے ماتحت تھے ان کا کوئی شریک کار نہ تھا۔ نواب سالار جنگ کی وفات کے بعد وہ راست میر محبوب علی خاں کے حسب ہدایت اور منشاء تمام امور کے لئے جو ان کے سپرد تھے بہ خوبی انجام دیتے تھے۔ اپنی گوناگوں مصروفیات کے باوجود انھوں نے اپنی علمی و ادبی خدمات سے ایک ضخیم علمی و ادبی ذخیرہ چھوڑا ہے وہ ایک بیش بہا خزانہ ہے۔ جس سے ایک مدت تک اہل علم مستفید ہوتے رہینگے۔ راجہ نرسنگ راج عالیؔ نے صحیح فرمایا ہے کہ

" ہے میکدہ، دہر میں نام باقی ساقی نہ سہی مگر ہے جام باقی
عالی نہ مٹے گا کبھی نام باقی ہے زندہ جاوید کلام باقی

میں نے اپنی اس حقیر کاوش میں اس گراں قدر خزانے سے چند علمی، ادبی، تہذیبی و ثقافتی کارناموں اور ان کی شخصیت سے نئی نسل کو روشناس کرانے کی کوشش کی ہے۔ گردھاری پرشاد باقی کی سوانح عمری شائع کرنے کا دوسرا مقصد یہہ بھی ہے۔ کہ جس ہندوستانی تہذیب پر ہم ناز کرتے ہیں اور یہہ کہکر فخر کرتے ہیں کہ اس کی گونج آج بھی سارے عالم میں سنائی دیتی ہے اس تہذیب کا ایک بے مثال نمونہ بنسی راجہ تھے جنھوں نے اس تہذیب کی شمع کو تعصب اور تنگ نظری کے جھونکوں سے بچاکر روشن رکھا۔ اس روشن چراغ کی روشنی آج بھی ہماری تاریکیوں میں مشعل راہ بن سکتی ہے۔

دراصل ہماری تہذیب کی بنیاد آج سے ہزاروں سال قبل رشیوں منیوں اور مہاتماوں نے رکھی تھی جو خود بڑے مفکر ادیب شاعر اور فن کار تھے۔

اس تہذیب کو اشوک اعظم، وکرمادتیہ، اکبر اعظم، کرشن دیورایا اور نواب محبوب علی خان جیسے شہنشاہوں اور حکمرانوں کی سرپرستی حاصل رہی۔

میر محبوب علی خان ایک صوفی منش انسان تھے انھوں نے مذہبی رواداری کو اپنا کر اپنے دور حکومت کو آصفجاہی سلاطین کی تاریخ میں ایک سنہری دور بنادیا۔ سنسکرت کی مشہور کہاوت ہے کہ "یتھا راجہ تتھا پرجا" یعنے جیسا راجہ ہوتا ہے ویسی ہی رعایا (یا عوام) بھی ہوتے ہیں یہہ کہاوت محبوب علی پاشاہ کے دور پر بالکل صادق آتی ہے۔

گردھاری پرشاد ایک ہمہ گیر شخصیت کے مالک تھے۔ وہ ایک قابل منتظم جراءت مند افسر اعلیٰ، بااخلاق اور اعلیٰ کردار کے رئیس وسیع النظر ذمہ دار ہندوستانی تھے جن کے دل و دماغ میں ملک اور مالک کے لئے بے لوث خدمت کا جذبہ بدرجہ اتم موجود تھا تو دوسری جانب وہ ایک مثالی ہندوستانی کا جیون گزارتے تھے کیونکہ وہ ہندوستانی تہذیب اور فلسفہ یعنے گیان کی بنیادی حقیقت سے بخوبی واقف تھے۔ اس

حقیقت کو تسلیم کرنے کے لیئے ان کے اردو کلام کے علاوہ ان کی فارسی اور ہندی تصنیفات کا مطالعہ بھی ضروری ہے ۔ ہندی میں گردھاری اپ نام یا تخلص فرماتے تھے بھگتی کے جذبات سے بھری ہوئی تین تصنیفات چھوڑ گئے ہیں جن کے نام ہیں ۔

۱۔ کیشوپران (وامن پوران کے ایک باب پر منحصر) طبع ہو چکی ہے ۔

۲۔ شمبھوپران جو شیو پوران کا خلاصہ ہے غیر مطبوعہ

۳۔ بھاگوت سار جو بھگوان کرشن کی زندگی کے حالات پر مبنی ہے (طبع ہو چکی ہے)

اس کے علاوہ بہت سے بھجن لکھے جس سے ان کی دھارمک گیان اور بھگتی بھاؤ کا پتہ چلتا ہے ۔

بھاگوت سار کی کچھ پنکیتوں کو انتخاب کلام کے باب میں شامل کیا گیا ہے ۔ فارسی میں انھوں نے نعت اور سلام لکھے ۔ خدا کے ۹۹ ناموں کی منظوم تشریح کی جو رباعیات بابرکات کے نام سے طبع ہوئی ۔ اس تصنیف اور نعت کو پڑھکر کوئی یہہ نہیں کہہ سکتا کہ یہہ ایک ہندو کی لکھی ہوئی ہیں ۔ شہمد بھاگوت کا فارسی میں ترجمہ کر کے بھاگوت شریف کے نام سے شائع کیا ۔ اس کے علاوہ رامائن مسیحا ملا مسیح (جو شہنشاہ جہانگیر کے دربار کے مشہور شاعر تھے) جنھوں نے رامائن کا فارسی میں ترجمہ کیا تھا اسے طبع کرواکر لوگوں میں تقسیم کیا ۔

ان کی تصنیفات کے مطالعے کے بعد یہہ کہنے میں کوئی جھجک نہیں کہ شائد اس عہد میں حیدرآباد میں ان کا کوئی ثانی نہ تھا ۔ جو بہ یک وقت تین زبانوں میں اپنی تخلیقی صلاحیتوں کو پیش کر سکتا تھا ۔ اس تخلقیقی صلاحیت کو انھوں نے اپنے سفرناموں میں بخوبی استعمال کیا ہے ۔ اس حقیقت سے سب ہی واقف ہیں کہ بھارت نے ہزاروں سال سے دنیا کے تمام مذاہب کے ماننے والوں کو پناہ دی ہے ۔ ہندوستانی بھاشاؤں کیساتھ بیرونی ممالک سے آنے والے اپنے ساتھ جو زبانیں ساتھ لائے جو تہذیبی روایات لیکر یہاں آئے ان سب کا یہاں ایک گلدستہ بن گیا ۔ جس گلدستے میں مختلف پھول الگ الگ اپنی انفرادیت اور اپنی شناخت بنائے رکھتے ہیں لیکن پھر وہ سب ملکر اس رنگ و بو

میں جا ملے جسے ہندوستانی تہذیب یا مشترکہ تہذیب کا نام دیا جاتا ہے۔

مختلف سیاسی و سماجی اور معاشرتی گروہوں میں کہیں نہ کہیں اختلافات ہونا ایک قدرتی بات ہے۔ جیسے کہ ایک ہی ماں کے بچوں میں کسی بات پر نااتفاقی ہو جائے لیکن ماں اپنے سب ہی بچوں سے ان کے اختلافات کے باوجود ایک سمان یا ایک جیسا برتاؤ کرتی ہے۔ دراصل یہہ یگانگت کا رحجان ہماری تہذیب کا وہ روحانی اور اخلاقی پہلو ہے جو رشیوں منیوں کے آشرم میں پروان چڑھتا رہا اور یہی پہلو بزرگان دین کی خانقاہوں میں قابل قبول ہوا کیونکہ اس میں انسان دوستی پریم اور خلوص کا جذبہ ہی کارفرما رہا۔ اسی اہم خصوصیت کی بناء پر ہماری تہذیب آج بھی قائم ہے اور دنیا کی بیس فی صد آبادی اس تہذیب سے پہچانی جاتی ہے۔

اس بات کو اقبال نے اپنے ان خوبصورت شعروں میں بیان کیا ہے:

یونان و مصر و روما سب مٹ گئے جہاں سے اب تک مگر ہے باقی نام و نشاں ہمارا
کچھ بات ہے کہ ہستی مٹتی نہیں ہماری صدیوں رہا ہے دشمن دور زماں ہمارا

وہ " کچھ بات " یہی بھگتی اور محبت پر مبنی ہماری تہذیبی شناخت ہے۔ ہماری تہذیب کی ایک اور خصوصیت یہہ رہی ہے کہ فرد کی دینی اور دنیوی ضروریات کو پورا کرنے کی پوری آزادی دی گئی۔ اور اس آزادی کو کسی نہ کسی انداز میں متحرک رکھنے والے یہہ چار اہم اصول تھے۔

(۱) سچائی کا راستہ یعنے مذہبی اصولوں پر کاربند رہنا۔ (۲) تعلیم اور حصول زر کی خواہش (۳) خوش حال زندگی گزارنا۔ (۴) نجات (یعنے موکش) پانے کی جستجو اور یہی اصول زندگی گزارنے کا راستہ دکھلاتے رہے۔ اسطرح ہماری تہذیب کی بنیادیں روحانیت اور اخلاق پر رکھی گئیں۔ اس لئے وہ کسی بھی بیرونی حملہ آور کا مقابلہ کرنے میں کامیاب رہی اور دلچسپ بات یہہ ہے کہ اس تصادم میں حملہ آوار کو یہہ پتہ ہی نہ چلا کہ کون جیتا اور کون ہارا کیونکہ ہماری تہذیب ایک Melting Pot تھا

جس میں ہر آنے والا گھل مل گیا۔

مغربی تعلیم سے متاثر جو احباب سیکولرزم کا نعرہ لگاتے رہے ہیں ان کا یہ استدلال ہے کہ حصول تعلیم سے معاشی اور صنعتی ترقی ممکن ہے اور معاشی ترقی کی بناء پر ہمارے سماج سے تعصب اور فرقہ پرستی کا صفایا ہو جائے گا۔ لیکن اس طرز تعلیم میں کس طرح فرد یا مجموعی طور پر پورے سماج کو اپنی تہذیب و تمدن سے روشناس کرایا جائے؟ اس جانب کوئی خاص توجہ نہیں دیجاتی۔ مذہبی رواداری اور یگانگت کی جو عملی تربیت خاندان اور خاندان سے باہر آشرم یا خانقاہ میں ملتی تھی وہ ایک ایسے پہلو کی حامل تھی جو ایک دوسرے سے محبت و خلوص برتنے کی طرف راغب کرتی تھی باوجود اس کے کہ ظاہری اختلافات موجود تھے۔ لیکن ایک دوسرے کے لئے خلوص اور اعتماد کا جذبہ جاری و ساری تھا جو آج دور دور تک دکھائی نہیں دیتا۔ نتیجتاً آج فرد اور سماج کا بہت بڑا طبقہ اپنے تہذیبی ورثے سے بے خبر تعصب کے اندھے کنویں میں گرتا جارہا ہے اس کمزوری کا پورا پورا فائدہ متعصب سیاست داں اور Pseudo Secularists اٹھا رہے ہیں۔ ایسے ماحول میں بیرونی ممالک سے مذہبی جنون کی چنگاری کو ہوا دینے کی تھوڑی سی کوشش بھی شعلہ بن کر بھڑک اٹھتی ہے۔ یہی وہ وجوہات ہیں جو ہماری تہذیب کی بنیادوں کو کمزور کر رہی ہیں۔ اس فضاء کے اور مکدر ہونے سے پہلے مناسب یہی ہے کہ ہر مذہب کے مثبت اور تخلیقی پہلوؤں سے اپنے کو مجموعی طور پر روشناس کروائیں اور اس پر عمل پیرا رہیں۔ ایسی کسی بھی کوشش میں کامیابی کے لئے راجہ گردھاری پرشاد جیسی شخصیتوں کی زندگی ہمارے لئے مشعل راہ ہے۔ سچا کلچر کتابوں اور اشتہاروں سے نہیں بلکہ دانشمند ذمہ دار باکردار لوگوں کی کامیاب زندگی سے بنتا ہے۔ ایسے راستے پر چلنے والا، آدمی نہیں انسان کہلاتا ہے ورنہ:

آدمی کو بھی میسر نہیں انساں ہونا

اور یہی اقدار ایک مہذب قوم کی شناخت اور علامت ہیں۔ صداقت سے ایسی عملی قوت حاصل ہوتی ہے جو زندگی کے مسائل کو سمجھنے اور اس سے نمٹنے میں ہر انسان

کی ہر وقت مدد کرتی ہے ۔ لیکن جب فرد اور سماج اپنی وراثت سے بے بہرہ رہتے ہیں اور لاپرواہی برتتے ہیں تو تصادم اور تنازعہ پیدا ہو جاتا ہے ۔

ہم جس دور کا جائزہ لے رہے ہیں اس عہد میں تنازعہ اور تصادم کی گنجائش ناممکن تھی وہ اس لئے کہ وہ سکیولرزم کا نعرہ لگائے بغیر ہی اس راستہ پر گامزن تھے جو ہر لحاظ سے سکیولر تھا ۔ اور یہہ ایسی وراثت ہے جس کے محافظ یا Trustee گردھاری پرشاد جیسی شخصیتیں ہر دور میں آنے والی نسلوں کے لئے اپنے کارناموں سے کچھ نہ کچھ اضافہ کرتی رہیں ۔

وہ سب یہہ اچھی طرح جانتے تھے کہ اس دیش میں کئی طرح کے رواج اور روایات اور عقیدے ایک منبع سے پیدا ہوئے ہیں ۔ اس لئے جہاں انھوں نے کاشی میں بھاسکر آنند سرسوتی سے عرفان اور وحدت کی تعلیم حاصل کی تو وہیں انھوں نے محبوب علی پاشا سے کاشی کے پنڈتوں کو مٹھائی اور نقد رقم بہ طور دکشنا دلوا کر اس دھارمک پرمپرا کو مضبوط کیا جو سینکڑوں سال سے رائج ہے میر محبوب علی خان کے طرز عمل اور اکبر کی مذہبی رواداری میں بہت سی باتیں مشترک دکھائی دیتی ہیں ۔ تاریخی شہادت سے ثابت ہے کہ اکبر کا بھی تولادان ہوا تھا ۔ محبوب علی پاشاہ نے بھی گردھاری پرشاد کی خواہش پر اپنا تولادان کرانے کی اجازت دی تھی ۔

محبوب علی پاشاہ عوام میں بلالحاظ مذہب و ملت بہت ہر دلعزیز تھے ۔ ہندو اپنے بچوں کے نام ان کے نام پر رکھنے میں بڑی خوشی محسوس کرتے تھے ۔ اور غالباً اس کی شروعات بنسی راجہ نے کی اور پھر راجہ مرلی منوہر (مالوالا خاندان) نے بھی اس کو آگے بڑھایا ۔ گردھاری پرشاد ایک سچے ہندو کی طرح جہاں مانک پربھو مہاراج اور بھاسکر آنند کے معتقد تھے وہیں وہ خواجہ اجمیری اور حسین شاہ ولی سے والہانہ عقیدت رکھتے تھے جس کا ثبوت ان کی منظومات سے ملتا ہے وہ اس لئے کہ ان کے دل میں بھارت کے اس قدیم راستے پر چلتے رہنے کی لگن تھی جو روحانیت کا راستہ کہلاتا ہے ۔ کیونکہ ان کی زندگی کا نصب العین تھا وہ روحانی منزل جہاں پہنچنے پر نہ کوئی ہندو ہے نہ مسلمان بلکہ

سب انسان ہیں اور صرف انسان ۔ جسے فلسفہ ویدانت میں " امرتسیہ پتر " کہا گیا ہے اور اسی نظریہ کو واضح کرتے ہوئے شہمد بھاگوت میں واسودیو کٹمبھ کا نام دیا گیا ۔ یعنے سارے انسان ایک ہی خاندان کے رکن ہیں جسے حضرت محمدؐ کے الفاظ میں " الخلق عیال الله " یعنی تمام مخلوق اللہ کا خاندان ہے کہا گیا ہے ۔

مجھے اس حقیر کاوش کے کتاب کی شکل اختیار کرنے تک بڑے طویل اور پیچیدہ مراحل سے گزرنا پڑا ۔ یہ اس لئے بھی کہ یہ میری پہلی کوشش ہے اس سلسلے میں سب سے پہلے اور سب سے زیادہ میں شکر گزار ہوں اپنے عزیز دوست مہیش آنند کا جن کی بارہا ہمت افزائی اور مسلسل تعاقب کے باعث یہ کام پایۂ تکمیل کو پہونچا ۔

میں اپنے استاد محترم ڈاکٹر جعفر نظام سابق وائس چانسلر کاکتیہ یونیورسٹی کا بھی مشکور ہوں جنھوں نے میری کتاب کے مسودے کو پڑھکر اپنے پیش لفظ سے اس کی وقعت میں اضافہ کیا ۔

جناب سوداگر انور آئی ۔ اے ۔ ایس سکریٹری حکومت آندھراپردیش نے بھی میری بہت ہمت افزائی کی اور ان کے شکریے کے لئے میرے پاس الفاظ نہیں ۔

پروفیسر ڈاکٹر یوسف سرمست شعبہ اردو جامعہ عثمانیہ اور جناب مضطر مجاز کا بھی میں بے حد شکر گزار ہوں کہ ان حضرات نے میرا مسودہ بڑی تفصیل سے ملاحظہ فرمایا اور مفید مشورے دیئے ۔

میں اپنے بزرگ ڈاکٹر روی نندن پرتاپ ، عزیز بھائی ڈاکٹر نارائن راج اور بھاوج ڈاکٹر شیلاراج کا بے حد ممنون ہوں جنھوں نے نہ صرف ضروری دستاویزات بہم پہونچائیں بلکہ اپنے مفید مشوروں سے بھی مجھے سرفراز کیا ۔

بھاسکر راج سکسینہ

آونتی نگر

حیدرآباد ۔ ۵۰۰۰۲۹

آندھراپردیش

پیش لفظ

ڈاکٹر جعفر نظام سابق وائس چانسلر کاکتیہ یونیورسٹی
و
صدر ادارہ ادبیات اردو حیدرآباد

ڈاکٹر بھاسکر راج سکسینہ نے راجہ گردھاری پرشاد باقیؔ جو اعلیٰ حضرت نواب میر محبوب علی خان کے عطا کردہ لقب بنسی راجہ سے زیادہ جانے اور پہچانے جاتے ہیں کی شخصیت اور حالات زندگی کا جائزہ لیکر اپنے اسلاف کے کارناموں کو موثر انداز میں پیش کیا ہے۔

بنسی راجہ حیدرآباد کی قدیم تہذیب کے پیکر مجسم تھے انہوں نے ہمیشہ اخلاقی اقدار کی پاسداری کی اور ایک نیک صفت انسان کے روپ میں سماج میں اعلیٰ مقام حاصل کیا۔ بنسی راجہ نے اپنی غیر معمولی قابلیت اور بے پناہ صلاحیتوں کی وجہ سے اعلیٰ حضرت نواب میر محبوب علی خان اور سالار جنگ اول سے قربت حاصل کی اور اپنی گوناگوں ذمہ داریوں کو نہایت اعتماد اور سلیقہ سے پورا کیا۔ اور شاید انہی خوبیوں کی وجہ سے وہ حضور پرنور کے مقرب خاص بنے رہے۔ سفرناموں سے یہ بات واضح ہوجاتی ہے کہ روحانی اعتبار سے انہیں ہندو دھرم سے بے پناہ عقیدت تھی مگر دوسری طرف بزرگان دین اور خانقاہوں سے عقیدت مندانہ جذبہ رکھتے تھے اور تمام مذاہب کا احترام انکا شعار تھا۔ انہیں تینوں زبانوں فارسی، اردو اور ہندی میں اعلیٰ درجہ کی مہارت تھی اور یکساں استعداد سے شاعری کرتے تھے۔ ہندی شاعری کے لئے انہوں نے اپنا تخلص "گردھاری" رکھا تھا۔ ان کی شاعری میں جابجا مذہبی رواداری کے تعلق سے نمایاں

اشارے ملتے ہیں۔

بنسی راجہ کی ہمہ پہلو شخصیت کے اہم گوشوں کو ڈاکٹر بھاسکر راج سکسینہ نے نہایت ہی خوبی سے لکھا ہے جس کو پڑھکر قاری قدیم حیدرآباد کے تہذیبی ورثہ سے یقیناً متعارف ہوگا۔ مصنف کی یہ کوشش کہ اسلاف کے کارناموں کا تحفظ ہوجائے اور یہ نئی نسل تک پہنچ جائیں قابل ستائش ہے اس سے نہ صرف مٹتی تہذیب کے اعلیٰ اقدار کا احیاء ہوگا بلکہ کچھ حد تک نوجوانوں کے شعور کی بیداری کا باعث بنے گا مجھے یقین ہے کہ یہ کتاب ہماری نئی نسل کو حیدرآباد کی قدیم روایات اور تہذیبی، ثقافتی اور اخلاقی اقدار کو سمجھنے کے لئے ممدومعاون ثابت ہوگی۔

جعفر نظام

تعارف

اسی اپریل کی وہ ایک گرم صبح تھی کہ ٹیلی فون کی گھنٹی بجی عزیزم رفعت سلیم (مالک اسپیڈ پرنٹس، سعید آباد) کسی بھاسکر راج سکسینہ صاحب کا ذکر کر رہے تھے کہ ان کی ایک کتاب حیدر آباد کے بنسی راجہ کی حیات اور کارناموں پر مبنی ان کے یہاں چھپنے آئی ہے اور بھاسکر راج صاحب اس کی کتابت و طباعت کے ہفت خواں سے گزرنے کے لئے ایک ہم سفر کی تلاش میں ہیں۔ اس کام کے لئے سلیم صاحب نے میرا انتخاب کیا۔ میں نے عرض کیا کہ میں ذرا مسودہ دیکھ بھال لوں تو کچھ کہوں۔ آناً فاناً مسودہ میرے پاس پہونچ گیا، گو اس وقت بھاسکر راج صاحب سے ملاقات نہ ہو پائی۔ اب جو میں نے مسودے پر سرسری نظر ڈالی تو حیران رہ گیا کہ بنسی راجہ تو خیر اپنے وقت کے عبقری تھے ہی لیکن ان کے پڑپوتے بھاسکر راج صاحب ان کے ایسے اخلاف میں سے نکلے جن کو اپنے اجداد کا علم نہ صرف پوری طرح ازبر ہے بلکہ وہ ایک ایسا پسر ہے جو ہر لحاظ سے لائق میراث پدر بھی ہے اور جو ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھا رہنے والا بھی نہیں۔ اگرچہ وہ وٹرنری ڈاکٹر ہیں لیکن علم و ادب سے شغف ان کو ورثے میں ملا ہے۔ ان کے جد امجد راجہ گردھاری پرشاد باقیؔ ایک ہمہ پہلو شخصیت کے مالک تھے وہ ایک قابل ایڈمنسٹریٹر ہونے کے ساتھ ساتھ نہایت اعلیٰ پائے کے شاعر بھی تھے نہایت درجہ معاملہ فہم اور نہایت زود رس اور تیز فہم نگاہ کے مالک، بڑی بڑی سنجیدہ گتھیاں انھوں نے پل مارتے سلجھادیں، جس کی تفصیلات آپ کو اس کتاب میں ملیں گی۔ ان کے فرزند نرسنگ راج عالیؔ کا شمار بھی حیدر آباد کے بلند پایہ شاعروں میں ہوتا ہے ہمارے بھاسکر راج صاحب انھیں کے پوتے اور بنسی راجہ کے پڑپوتے ہوتے ہیں مختصر یہ کہ

ایں خانہ تمام آفتاب است!

بھاسکر راج صاحب اپنے پرکھوں کی روایات کے امین بھی ہیں اور محافظ بھی۔ انھوں نے اپنے جد امجد کے دور کے تمام مخطوطات، منقولات، معقولات اور مطبوعات کی جی جان سے حفاظت کی ہے جن کے کچھ عکس اور تراشے آپ کو اس کتاب میں دیکھنے

کو ملیں گے۔ یہ کتاب لکھ کر بھاسکر راج صاحب نے اس دور کو زندہ کر دیا جو شاید اب کبھی لوٹ کر نہ آئے۔ ہمارے ارباب اقتدار، جو زمین کے اس خطے میں جسے ہندوستان یا بھارت کہا جاتا ہے ایک مدت سے کوشاں ہیں کہ کسی طرح قومی یک جہتی قائم ہو لیکن جتنی وہ کوشش کرتے ہیں اتنے ہی الٹے نتائج نکلتے جاتے ہیں:

بدنصیبی اس کو کہتے ہیں کہ میرے ہاتھ میں
آتے ہی خاصیت اکسیر آدھی رہ گئی

لیکن وہ لوگ بڑے خوش نصیب تھے۔ وہ تو مٹی میں بھی ہاتھ ڈال دیتے تو سونا بن جاتی اور یہ انوکھی صفات ان بزرگوں میں اس لئے پیدا ہوئی تھیں کہ ان کا من پاک تھا۔ انھوں نے صرف اپنے من میں ڈوب کر زندگی کا سراغ پایا تھا جبکہ ہمارا نہ من پاک ہے نہ دامن! جس کا نتیجہ ہم پچھلی چار پانچ دہائیوں سے بھگتتے چلے آرہے ہیں۔ شکر ہے کہ ان بزرگوں کی زندگیاں تاریخ کے حافظے میں محفوظ ہیں اور ان کو اگر ہم پلٹ کر دیکھیں تو کیا عجب کہ ہماری تقدیریں کھلیں۔ ہم وہ تو بن نہیں سکتے لیکن ان کا ذرا سا عکس بھی ہم پر پڑ جائے تو عجب نہیں کہ ہمارے دن پھر جائیں۔ یہ ان دنوں کی باتیں ہیں جب "سیکیولرزم" ایجاد نہیں ہوا تھا۔ ہندو مسلمان تو کجا برہمن غیر برہمن، شیعہ، سنی کا فرق کرنا نہایت معیوب سمجھا جاتا تھا اس دور کی آخری مدھم سی جھلک اس چشم گنہ گار نے بھی دیکھی ہے جب ایک ہی قومی دھارے میں بہنے کے باوجود ہر طبقہ اور فرقہ اپنی انفرادیت برقرار رکھے ہوئے تھا۔ اپنی انفرادیت کے تحفظ کو غداری پر محمول نہیں کیا جاتا تھا۔ راجہ گردھاری پرشاد باقیؔ اپنی سوسائٹی میں شیر و شکر رہنے کے باوجود ایک سچے اور پکے ہندو تھے، صرف اعمال و افکار سے نہیں بلکہ اپنی ظاہری وضع قطع سے بھی۔ جب کہ ہم ہندو یا مسلمان جیسے اعمال و افکار رکھتے ہیں نہ وضع قطع:۔

وضع میں تم ہو نصاریٰ تو تمدن میں یہود

ظاہر کو دیکھو تو کوئی فرق نہیں لیکن بہ باطن ہم بہت کٹے پھٹے اور بٹے ہوئے ہیں۔ ہم

گفتار سراپا ہیں وہ سراپا کردار تھے۔ اسی لئے ہم گلشن اجاڑ کر کلی کلی کو ترس رہے ہیں اور وہ گلستاں بہ کنار تھے اس کے باوجود:

چاہتے سب ہیں کہ ہوں اوج ثریا پہ مقیم
پہلے ویسا کوئی پیدا تو کرے قلب سلیم

ڈاکٹر بھاسکر راج سکسینہ کو وہی قلب سلیم ورثے میں ملا ہے وہ پلٹ کر جب اپنے پرکھوں کے ورثے پر نظر ڈالتے ہیں اور اپنے اطراف دیکھتے ہیں تو حیران رہ جاتے ہیں کہ کتنا بڑا فرق اور تفاوت آچکا ہے نہایت نرم خو لیکن اپنے نقطۂ نظر اور عقیدے پر اٹل۔ دنیا کو بھی خوب گھوم پھر کر دیکھا، سخت متحیر تو وہ اس وقت ہوئے جب انھوں نے اسپین کے سفر کے دَوران اپنے پاکستانی اور نائیجیریائی مسلمان ہم سفروں کو الحمرا اور قرطبہ کے وجود سے لاعلم پایا اور دوران سفر وہ انھیں اندلس کی تاریخ سے آگاہ کرتے رہے وہ اسلام کے بارے میں بھی اتنی ہی معلومات رکھتے ہیں جتنی ہندو ازم کے بارے میں۔ اس لئے کسی کنفیوژن کا شکار نہیں۔ مذہب کو روحانی بالیدگی کے حصول کا ایک ذریعہ سمجھتے ہیں، ہوس اقتدار کا زینہ نہیں مانتے۔ دیوانگی کی حد تک اردو سے محبت رکھتے ہیں ان کے دو درجن سے زائد مضامین حیدرآباد کے موقر روزنامہ "سیاست" میں چھپ چکے ہیں۔ ریٹائرمنٹ کے بعد لکھنے پڑھنے کا مشغلہ بڑھ گیا ہے کہنے لگے کہ ایک وٹرنیرین بعد وظیفہ کر بھی کیا سکتا ہے میں نے کہا کہ بھائی! انسان تو اب خاصہ جانور بنتا جارہا ہے آپ کی پریکٹس کا میدان تو اب اور بھی وسیع ہوجانا چاہیئے۔ لیکن وہ مایوس نہیں۔ کہتے ہیں

آپ ہوں، میں نہیں انسان سے مایوس ابھی
ابھی پھوٹے ہیں شگوفے، ابھی کم سن ہے بہار

پچاس سال ایک قوم کی زندگی میں کیا حیثیت رکھتے ہیں وہ سوامی وویکانند کی ان تعلیمات پر یقین رکھتے ہیں کہ ایک دن ہندو ازم اور اسلام کے بہترین عناصر اس

خطہ ارض کی نجات کا باعث بنیں گے۔ مشترک کلچر اور ہندوستانی تہذیب و تمدن پر
ان کا ایمان اتنا پختہ ہے کہ کسی بڑے سے بڑے مذہبی انسان کا اپنے مذہب پر بھی نہ ہوگا
حیدرآبادی تہذیب جس کی آج بھی چار دانگ عالم میں دھوم ہے اس کی بنیاد رکھنے والی
نیک ہستیوں میں سے ایک بلند قامت ہستی بنسی راجہ کی بھی تھی جنھوں نے بھاگوت
سار کا ترجمہ کیا تو بسم اللہ الرحمن الرحیم سے شروع کیا، خواجہ میر دردؔ کی فارسی رباعیات
کا ایسا منظوم ترجمہ کیا کہ بقول زور اصل کا گمان گزرتا ہے۔ ان کی شخصیت کے اور بھی
کئی پہلو ہیں جو آپ کو اس کتاب میں ملیں گے۔ اس کتاب میں بھاسکر صاحب نے پھر وہ
صبح و شام دکھانے کی کوشش کی ہے جس کی یاد ہر حیدرآبادی کی رونق خاطر ہے اور
جس کا ذکر شمع شبستان تمنا۔ تہذیب، اقدار کے تسلسل کا نام ہے۔ یہ کتاب ان اقدار
کو تسلسل عطا کرنے کی ایک کوشش ہے۔ غالب نے تو کہا تھا کہ

دل نہیں ورنہ دکھاتا تجھ کو داغوں کی بہار

لیکن بھاسکر راج صاحب "دل" رکھتے ہیں وہ فانی کی طرح یہ کہنے کے موقف میں ہیں
کہ

مختصر قصہء غم یہ ہے کہ "دل" رکھتا ہوں

اور اس دل میں جو داغوں کی بہار ہے اس کی ایک ہلکی سے جھلک ہے زیر نظر
تصنیف جو اپنے ہر قاری سے مخاطب ہو کر کہہ رہی ہے:

گاہے گاہے باز خواں ایں قصہء پارینہ را
تازہ خواہی داشتن گرداغ ہائے سینہ را

مضطر مجاز

۲۱/ مئی ۱۹۹۵ء
حیدرآباد

بنسی راجہ بہ یک نظر

راجہ گردھاری پرشاد باقیؔ
بنسی راجہ
لقب عنایت کردہ محبوب علی پاشاہ
سال پیدائش جولائی ۱۸۲۸ء وفات جولائی ۱۸۹۶ء

خطابات

راجہ بہادر سن ۱۸۸۳ء
بہ مسرت جشن سالگرہ مبارک

محبوب نواز ونت ۱۸۹۳ء
عماری و نوبت و روشن چوکی سرفراز ہوا ۱۸۹۳ء
بہ مسرت جشن سالگرہ مبارک

خدمات

اتالیق میر محبوب علی خان نظام ششم
صدر سرشتہ دار فوج باقاعدہ و بے قاعدہ
صدر مشرف باورچیخانہ و خانسامانی

شجرہ راجہ گردھاری پرشاد باقیؔ

روپ چند

سیتاب رائے

نوبت رائے | دولت رائے

(سن ۱۷۳۰ء میں آصفجاہ اول کیساتھ حیدرآباد آئے)

نرسنگ بھان | راجارام وفات 1822ء

(رائے سوامی پرشاد) وفات 1823ء

نارائن پرشاد | رائے نرہری پرشاد (1808ء تا 1882) | نرسنگ پرشاد

(راجہ گردھاری پرشاد باقیؔ) (المعروف بہ بنسی راجہ) (1828–1896)

راجہ کیشو پرشاد (1862–1887) | راجہ نرسنگ راج عالیؔ (1889–1957) | رائے محبوب راج محبوب (1893–1931)

رائے نرہر راج ساقیؔ (1908–1985) | شام راج (1915–1981) | رام راج (1919)

گردھر راج (1914–1979) | جنک راج (1922–1964) | وی راج

آباواجداداور خاندانی پس منظر

۱۷۲۴ء میں نواب قمرالدین علی خان نے جوبعدمیں نظام الملک آصف جاہ اول کہلائے جب دہلی سے اورنگ آباد کے لئے کوچ کیاتو مغلیہ حکومت کے بہت سے تجربہ کار اور قابل اعتماد عہدہ داروں اور ملازمین کو اپنے ساتھ حیدرآباد لیتے آئے۔ ان میں سے بہت سے لوگوں نے شہر حیدرآباد کو مستقل طور پر اپنا وطن بنالیا۔ آصف جاہ اول نے جب ایک نئی ریاست کی تشکیل کی تو انھوں نے قابل اعتماد عہدہ داروں پر بھروسہ کیا اور ان کی لیاقت اور کارکردگی سے استفادہ کرتے ہوئے ایک نئے نظم ونسق کی بنیاد ڈالی۔ ان ہی چند شخصیتوں میں سے تھے گردھاری پرشاد کے جداعلیٰ دولت رائے۔ انکی قابلیت، ذہانت اور دیانت داری سے متاثر ہوکر انھیں مختلف عہدوں پر فائز کیا گیا۔

آصفجاہ اول کی راجدھانی پہلے اورنگ آباد تھی۔ وہاں دولت رائے کی نگرانی میں کئی عمارتیں تعمیر ہوئیں۔

آصفجاہ اول نے جب اپنا دارالخلافہ حیدرآباد منتقل کیا تو دولت رائے بھی انکے ساتھ حیدرآباد آئے اور یہاں مستقل سکونت اختیار کرلی دولت رائے کے والد سیتاب رائے دنیاداری کو تیاگ کر بہ راہ جوالامکھی ہمالیہ چلے گئے۔

دولت رائے کے دو فرزند تھے نرسنگ بھان اور راجارام

نرسنگ بھان نے ۱۷۸۹ء میں جنگ پنگل میں اپنے مالک آصفجاہ ثانی کیساتھ میدان جنگ میں شانہ بہ شانہ لڑائی میں حصہ لیا۔ راجارام بھی قابل، ذہین اور منتظم شخصیت کے مالک تھے۔ وہ علم ریاضی میں ماہر تھے اس قابلیت کو ملحوظ رکھتے ہوئے انھیں مستوفی کے خطاب سے سرفراز کیا گیا۔ وہ (۳۶) سرکاری محکمہ جات کے محاسب یعنی Accountant مقرر کیے گئے تھے۔

وہ شاہی باورچی خانہ کے صدر خانساماں کے عہدے پر بھی فائز ہوئے۔ انھوں نے قدیم شہر کے محلہ جنجی پوره میں جسے حسینی علم بھی کہا جاتا ہے ایک عالیشان مکان

خرید کر سکون سے زندگی بسر کی ۔ جب اس کو توسیع دے کر اور عمارتیں تعمیر کی گئیں تو یہہ علاقہ بنسی راجہ کی دیوڑھی کہلایا ۔ (آج بھی دیوڑھی کا دایون خانہ باقی ہے) ان کا انتقال ۱۸۲۲ء میں ہوا ۔

راجا رام کے بیٹے تھے سوامی پرشاد ۔ وہ ایک فرض شناس اور ذمے دار شخصیت کے مالک تھے ان کا موروثی جائیدادوں پر تقرر عمل میں آیا ۔ انھیں رائے کے خطاب سے سرفراز کیا گیا ۔ ان کو تین لڑکے اور دو لڑکیاں تھیں ۔ لیکن ان کے دوسرے بیٹے نرہری پرشاد ان کے جانشین بنے ۔ سوامی پرشاد کے انتقال کے وقت ان کی عمر صرف ۱۴ سال تھی ۔ لیکن حکمران وقت نے انھیں ان کے والد کے تمام خدمات پر مامور کیا ۔

ان کی اعلیٰ کارکردگی اور اخراجات میں بچت اور احتیاط برتنے کی اسکیمات سے سرکاری خزانے کو بہت بچت ہوئی ۔ ان صلاحیتوں کے اعتراف میں نواب ناصر الدولہ نظام چہارم نے انھیں بیش بہا جواہرات بطور تحفہ عطا کئے ۔

نواب ناصر الدولہ کے بعد نواب افضل الدولہ تخت نشین ہوئے انھوں نے بھی نرہری پرشاد کی خدمات کے صلے میں انھیں پنج صدی منصب اور مقطعہ پانسالی عطا کیا ۔

نرہری پرشاد اپنے مرنے سے ۱۵ سال قبل اپنے تمام سرکاری عہدوں سے سبکدوش ہوگئے اور اپنے بڑے بیٹے گردھاری پرشاد کو اپنا جانشین مقرر کروایا ۔

انھوں نے دیوی دیول واقع چندرائین گٹہ (تیار کردہ گردھاری پرشاد) میں گوشہ تنہائی میں یوگ وسشٹ کا سنسکرت سے ہندی میں ترجمہ کیا ۔ یوگ وسشٹ سنسکرت کی ایک عظیم تصنیف ہے ۔ بھگوان رام کے گرو وسشٹ جی نے جو فلسفہ وحدت یعنے گیان سری رام جی کو بتلایا تھا اس کتاب میں اس کا تفصیلی ذکر ہے ۔ وہ سنسکرت اور ہندی کے پنڈت تھے اور ایک بھگت کوی تھے ۔ یوگ وسشٹ کا ترجمہ بہ عنوان نرہری پرکاش ۱۸۷۶ء میں چھپوا کر اس کی سینکڑوں جلدیں حیدرآباد اور کاشی میں مفت تقسیم کیں ۔ اس کا ذکر سفرناموں کے باب میں آگے آئے گا ۔

اس کتاب کی رسم اجراء حیدرآباد میں کوٹھی اچپل رائے واقع ٹکسال میں انجام

پائی اس کی اشاعت کے بعد بحث و مباحثہ کا ایک عرصے تک سلسلہ چلتا رہا۔

نرہری پرشاد کی دو اور تصانیف بھجنوں کا مجموعہ نرہری مال اور نرہری گیان اپدیش بھی شائع ہوئے۔

وہ ایک عالم باعمل تھے ان کا دیہانت ۱۸۸۲ء میں ہوا ان کے پتر گردھاری پرشاد نے تاریخ وفات سمت سال اور ہجری سال میں اسطرح نکالی۔

بارہ سو ستانوے چھوتی صفر نہار * سری نرہری پرشاد جیو تیاگ دیئے سنسار

(۱۲۹۷ ہجری)

سمت کی تاریخ ہے جیسو نرمل نیر * نرہری چھتر سوہایو جگ مچکندا کے تیر

۱۹۳۶ سمت

ابتدائی حالات زندگی اور تعلیم

رائے نرہری پرشاد کے بڑے بیٹے گردھاری پرشاد کا جنم ۱۴/ جولائی ۱۸۲۸ء میں کالیستھ گھرانے میں شہر حیدر آباد میں ہوا۔

۱۴ بھائی بہنوں میں صرف گردھاری پرشاد ہی زندہ رہے۔ کم عمری سے بڑے ذہین تھے۔ ۱۲ سال کی عمر ہونے تک اپنی ابتدائی تعلیم مکمل کرلی۔ مطالعہ اور عالموں کی صحبت کا شوق تھا اور اسی وجہ سے کم عمری ہی سے شعر و ادب کا ذوق پیدا ہوگیا۔ گردھاری پرشاد کی دو شادیاں ہوئیں۔ پہلی شادی ۱۸۴۲ء میں ہوئی اس شادی سے فرزند راجہ کیشو پرشاد جو مددگار صدر محاسب تھے اور ایک صاحبزادی شریمتی سیلورانی دو یادگاریں ہوئیں۔ پہلی بیوی کا انتقال ۱۸۷۴ء میں ہوا۔ دوسری شادی کیلئے وہ راضی اس لئے نہیں تھے کہ انھیں اپنے دونوں بچوں کیساتھ خوش حال زندگی گزارنے کی خواہش تھی لیکن مہاراجہ نریندر نارائن پرشاد، پیشکار نواب سالار جنگ اول کے بے حد اصرار پر دوسری شادی رائے عالم چند معتمد اسٹیٹ راجہ نریندر کی چھوٹی پوتی (دختر رائے بنسی دھر) کیساتھ ۱۸۷۵ء میں انجام پائی۔

شادی نہ کرنے کے لئے انھوں نے یہہ عذر پیش کیا تھا کہ ان کی مالی حالت دوسری شادی کا خرچ اٹھانے کے قابل نہیں ہے۔یہہ سن کر سالار جنگ اول نے ۱۲ ہزار روپیہ بقایا تنخواہ سرکاری خزانے سے ایصال کروائی اور اس تاکید کیساتھ کہ یہہ رقم شادی کے اخراجات پر خرچ کی جائے۔

شادی کی پہلی تقریب تلک سے لے کر دوسری اہم تقاریب میں راجہ نریندر اور نواب سالار جنگ نے شرکت کی۔(اس کا ذکر سفرنامے میں بھی درج ہے)۔

دوسری شادی سے ۵ لڑکے اور ۵ لڑکیاں تولد ہوئیں۔گردھاری پرشاد کے انتقال کے وقت صرف دو لڑکے راجہ نرسنگ راج اور رائے محبوب راج اور لڑکیوں میں گجرارانی۔جگد مبارانی۔للتارانی اور درگارانی حیات تھے۔

خدمات

گردھاری پرشاد کی عملی زندگی کا آغاز سن ۱۸۵۰ء میں بہ حیثیت سررشتہ دار فوج نواب رونق علی خاں شاہ یارالدولہ شاہ یارالملک سے ہوا۔اس فوج میں بدامنی اور بغاوت اس وقت اتنا زور پکڑ چکی تھی کہ باوجود نواب ناصرالدولہ کے حکم دینے کے بھی فوج اطاعت گزاری کے لئے تیار نہیں تھی لیکن گردھاری پرشاد نے اپنی حکمت عملی اور سوجھ بوجھ سے باغی سپاہیوں کو اطاعت گزاری پر آمادہ کرلیا۔

اس کار نمایاں کے انجام دینے پر شکریہ ادا کرنے کے لئے نواب رونق علی خاں نے انھیں اپنی فوج کا سررشتہ دار مقرر کرنے کی پیشکش کی۔رائے نرہری پرشاد نے یہہ کہہ کر انکار کیا کہ ہم سرکار آصفیہ کی خدمات سے منسلک ہیں۔ہم آپ کی ہر طرح سے مدد کریں گے لیکن ملازمت قبول کرنا مشکل ہے۔

لیکن رونق علی خاں نے فوج کی سررشتہ داری گردھاری پرشاد کے حوالے کردی اس خدمت پر فائز ہونے کے چند مہینوں بعد نرہری پرشاد نے اپنی ساری موروثی خدمات سے سبکدوشی حاصل کی ان کی درخواست پر گردھاری پرشاد کو تمام خدمات پر

مامور کیا گیا۔

نواب سالار جنگ اول کے بارے میں یہہ کہا جاتا ہے کہ وہ ایک مردم شناس اور بہت ہی اعلیٰ درجے کے منتظم تھے۔ان کی نظر جب گردھاری پرشاد پر پڑی تو انھوں نے سن ۱۸۶۴ء میں فوج باقاعدہ کی تنظیم جدید کے لئے گردھاری پرشاد کا انتخاب کیا۔

اسطرح سالار جنگ نے گردھاری پرشاد کی صلاحیتوں کا بجا طور پر استعمال کیا۔

اس سے قبل بھی گردھاری پرشاد نے ایک نازک فوجی مسئلے کو حل کرنے میں اپنی سوجھ بوجھ کا عملی مظاہرہ کیا تھا اور سالار جنگ اول کے حکم کے مطابق سن ۱۸۵۷ء میں حیدرآباد کی افغان فوج کی سرکوبی بھی کی تھی ۔اس کے علاوہ راجہ ونپرتی کے سمستھان کے سپاہیوں کو تربیت دے کر ان کی فوج باقاعدہ میں ضم کیا تھا ۔ان کارناموں کے باعث انھیں صدر سررشتہ دار فوج باقاعدہ و بے قاعدہ کی خدمت پر فائز کیا گیا۔

وہ فوجی جو فوج باقاعدہ میں تقرر نہ پاسکے ان کو فوج بے قاعدہ کی شکل میں قائم رکھا گیا۔

بنسی راجہ نے فوج باقاعدہ و بے قاعدہ کا بیان اپنی تصنیف فارسی نظم کنوز التواریخ میں کیا ہے۔

سالار جنگ کی فوجی حکمت عملی کے تعلق سے اگلے صفحات میں علحدہ ایک باب قائم کیا گیا ہے جس میں بنسی راجہ کے قائم کردہ کارخانہ، بنادیق ، بارود و توپ اور کارخانہ چرم کا تفصیلی جائیزہ لیا گیا ہے ۔یہاں صرف اتنا کہنا کافی ہے کہ ان کارخانہ جات کے لئے سالانہ ۲۰ لاکھ روپے کا بجٹ تھا لیکن بعد میں یہہ کارخانہ جات برٹش سرکار نے بند کروادیئے۔

بنسی راجہ نے بہ حیثیت مشرف باورچیخانہ و خانساماں بہت اہم رول ادا کیا۔ یہہ خدمت موروثی تھی ۔اور اس خدمت کی بناء پر وہ میر محبوب علی خاں سے ہر دن سمپرک میں آتے ۔اسطرح جملہ شاہی تقاریب کا انتظام بنسی راجہ کے سپرد تھا اور وہ میر

محبوب علی خاں کے مزاج و منشاء سے اسقدر واقف تھے کہ سارے انتظامات اپنی ہی نگرانی میں کرواتے ان کے فرائض انجام دہی میں کوئی اور شریک نہ تھا۔

نواب سالار جنگ اول نے بنسی راجہ کو میر محبوب علی خاں کا اتالیق اور مقرب شاہی مقرر کیا تھا چنانچہ انھیں کی نگرانی میں محبوب علی خاں کی تسمیہ خوانی جیسی تقاریب بہت شاندار پیمانے پر انجام دی گئیں۔ ایسی تقاریب میں راجہ صاحب نے سرکاری عہدے داروں کیساتھ عوام کی شرکت کا بھی اہتمام کیا تھا۔

بہ حیثیت صدر خانساماں آپ میر محبوب علی خاں کے ساتھ کم و بیش ہر سفر میں ساتھ جاتے تھے۔ خاص طور سے دہلی۔ کلکتہ اور بنارس کے سفر کی تفاصیل سفرناموں کے باب میں درج ہیں۔

شاہی محلات کی ساری تقاریب چاہے وہ مغلائی دربار ہو یا انگریزی دربار، شادی، چھلہ یا سالگرہ کی رسومات ہوں یا عید، دسہرہ، دیوالی، ہولی و جشن نوروز کے دربار، ان سب کی ذمہ داری ان ہی کے سپرد تھی۔ اور ان تمام کاموں میں ان کا کوئی اور شریک کار نہ تھا۔

محبوب علی پاشاہ کی بہنوں کی شادیاں ان ہی کی نگرانی میں انجام پائیں مدار المہام (یعنے وزیر اعلیٰ) کے تقرر پر یا پھر امرائے عظام اور معززین کی شادی کے مواقع پر انھیں جواہرات اور زیورات جو حضور پرنور کیطرف سے عطا کئے جاتے تھے وہ بعد مشورہ بنسی راجہ عطا ہوتے۔

اس سلسلے میں حضور کا تحریر کردہ ایک خط شریک کتاب ہے (صفحہ نمبر ۱۱۲) صرف امراء اور رئیسوں کی ہی نہیں بلکہ وہ غریبوں اور بے کسوں کی بھی حضور سے سفارش کرتے اور ان کے معاملات کی یک سوئی بھی کرواتے تھے۔

مندروں کی تعمیر و ترمیم اور بزرگان دین یعنے مہاتماؤں سے ملاقات

بنسی راجہ میں ترمیم منادر یعنے دیولوں کی تعمیر و ترمیم کروانے کا اور منادر میں

پوجاپاٹ کا معقول انتظام کروانے کا عقیدت مندانہ جذبہ تھا۔ نواب رونق علی خان کیساتھ جب وہ عالم پور کے دورے پر گئے وہاں بھی انھوں نے نواب صاحب کو مشورہ دیا کہ ان کی جاگیرات میں واقع مندروں کی مرمت کروائی جاے اور پوجاپاٹ کے انتظام کے لئے جاگیرات کی آمدنی سے مالی امداد دی جاے۔

دیول چندرائن گٹہ کیشوگیری

دیول چندرائین گٹہ ایک قدیم مندر ہے۔ یہہ بھگوان کیشو سوامی بہ الفاظ دیگر سری بالاجی مہاراج کا دیول ہے جو قطب شاہی دور میں تعمیر ہوا تھا۔ اسے چتارائی نام کی میراشنی نے تعمیر کروایا تھا جسے چارمینار سے ۴ میل کے فاصلہ پر جانب جنوب ایک خوبصورت پہاڑی پر بنایا گیا تھا۔

سن ۵۸ - ۱۸۵۷ء کے درمیان اس علاقے میں ڈاکہ زنی اور لوٹ مار کی وارداتوں کی وجہہ سے پجاری اس مندر سے چلے گئے اور پوجاپاٹ تقریباً موقوف تھی ۲۵ مئی ۱۸۵۸ء کو بنسی راجہ نے سالار جنگ اول مدرالمہام کی اجازت لیکر اس مندر کو اپنے زیر انتظام لیا۔ اس دیول کی از سرنو تعمیر کروائی اور غیر آباد علاقے کو آباد کرنے کے لئے باغات باولیات اور کئی عمارتیں تعمیر کروائیں باغات کے نام اپنے والد نرہری پرشاد کے نام پر نرہری باغ اور چچا کے نام پر نارائن باغ رکھے۔

پھر اس آبادی کے اطراف فصیل یعنے کمپونڈوال اور چار بڑے دروازے تعمیر کروائے اس آبادی کا نام کیشو سوامی کے نام پر کیشو گیری رکھا۔

اس دیول اور علاقے کی باز آبادکاری پر لاکھوں روپیہ ذاتی طور پر صرف کیا۔ جس کا تفصیلی تذکرہ انھوں نے اپنی فارسی منظوم تصنیف کیشونامہ میں قلمنبد کیا ہے۔ یہہ دیول خوبصورت ہے۔ مندر میں شری بالاجی کی پتھر کی مورتی ہے۔ اس مندر سے متصل شری لکشمی جی کا مندر ہے۔ مندر کے سامنے ایک کھلا منڈپ ہے۔ پوجاپاٹ وشنو سمپرادے کے اصولوں کے لحاظ سے رائج کروائی اور متعدد تہواروں پر خاص پوجا کا بھی
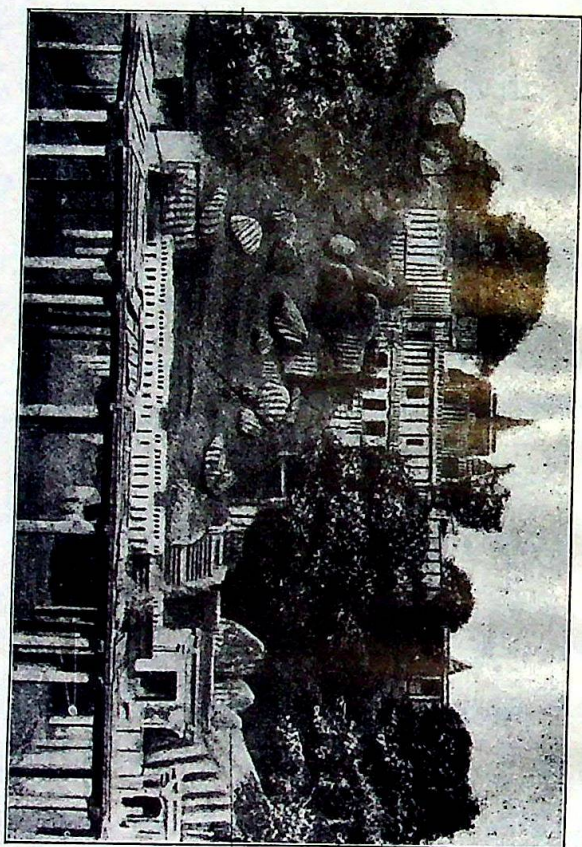
کیشوگری کا مندر
حیدرآباد سے ۵ میل پر ہے

بند و بست کیا ۔ دیول کے لئے سرکاری خزانے سے معاش بھی جاری کروائی ۔

سالانہ رتھ جاترا بہت عالیشان پیمانے پر انجام دینے کی روایت شروع کی ۔ دیول کے لئے مستقل آمدنی بنانے کے لئے زیننات اور مواضعات دان میں حاصل کئے ۔ دان دینے والوں میں ہندوؤں کے علاوہ مسلم حضرات بھی تھے ۔ کیشو گیری کی آبادی بسانے اور باغات لگانے کے لئے نواب افضل الدولہ نظام پنجم نے ۱۵ بیگہ زمین عطا کی ۔ کئی باولیات بھی تعمیر کروائیں ۔ مزید ۲۵ بیگہ زمین وقار الامراء نے نزول پر دی ۔ بالاجی کے مندر سے شمال کی جانب پہاڑ پر شیوجی کا دیول بھی تعمیر کروایا شیوجی کے مندر کی مغربی جانب کھنڈوباجی کا مندر تعمیر کروایا پہاڑ پر چڑھنے کے لئے دو جانب سے پتھر کی پختہ سیڑھیاں تعمیر کروائیں ۔ کیشو گیری اس شاہراہ عام پر واقع ہے جو حیدرآباد سے سری سلیم ہوتی ہوئی رامیشورم جاتی ہے ۔ اسی شاہراہ سے سادھو اور سنیاسی پیدل سری سلیم جایا کرتے تھے ۔ ان کے ٹھہرنے کے لئے دھرم شالہ اور دوران قیام ان کے کھانے کا بھی انتظام تھا ۔

اسی کے ساتھ ساتھ آبادی کیشو گیری میں درگا دیوی کا دیول تعمیر کروایا ۔ دیوی دیول کے احاطے میں مانک پربھو مہاراج ، جو مانک نگر میں قیام فرماتے تھے اور شری بھاسکر آنند سرسوتی مہاراج جو کاشی میں مقیم تھے کی تعظیم میں چھوٹے سے مندر بھی بنوائے ۔ گردھاری پرشاد کے پتا رائے نرہری پرشاد کی سمادھی بھی اسی دیول کے اندرونی حصے میں بنوائی ۔ نرہری پرشاد جی نے اپنے جیون کے آخری پندرہ سال اس دیول میں قیام کیا اور یوگ وسشٹ کا سنسکرت سے ہندی میں ترجمہ بہ عنوان "نرہری پرکاش" کیا جس کا پچھلے صفحات میں تفصیل سے ذکر آچکا ہے ۔

تذکرہ کیشو گیری بہ قلم دوارکا پرشاد افق لکھنوی :

آٹھ دن کیشو گیری میں جشن شاہانہ کئے
راجہ صاحب کے کئی مشہور مندر ہیں جہاں

یاں سبت مندر بنے ہیں فیض بخش خاص و عام
اہل عالم کو ہے پارس جنکا سنگ آستاں

اس جگہ بستی تو کیا شہر کلاں آباد ہے
اس کے باغوں کی بہار بے خزاں ہے باغباں

کرکے لاکھوں صرف بنیاد اسکی ڈالی آپ نے
اپنی قسمت میں لکھائے کل ثواب دوجہاں

دیول داما گنڈم :۔ داما گنڈم ایک چھوٹا سا پرفضا مقام ہے جو مستقر وقار آباد سے ۷ میل کے فاصلے پر واقع ہے ۔ مقامی لوگوں کے وشواس کے لحاظ سے بھگوان سری رام اپنے بن باس کے زمانے میں اس مقام سے گزرے تھے ۔ اس مقام پر بھگوان رام کا چھوٹا سا مندر ہے ۔

اس دیول کو آمدنی کا کوئی ذریعہ نہ تھا ۔ اسی وجہ سے پوجا پاٹ اور سالانہ رتھ جاترا کا کوئی انتظام نہ تھا ۔ بنسی راجہ نے اس مندر کو اپنے زیرانتظام لیکر یہاں پھر سے پوجا پاٹ اور جاترا کا سالانہ اتسو شروع کروایا ۔ جاترا شروع کروانے کا اہم پہلو شائد یہہ تھا کہ دیہاتی عوام کے لئے سماجی و معاشی سرگرمی کا ایک وسیلہ بن جائے ۔ جاترا داما گنڈم کے موقع پر جو دعوت نامہ اجراء کیا جاتا تھا اس کا خوشنما نمونہ درج ذیل ہے ۔

سری رام چندر مہاراج

داما گنڈم کی جاترا آئی ہے دیکھو تو عجیب بہار صحرائی ہے
خود آپ سری رام یہاں آئے ہیں خوب اس کی صفت بیاس نے فرمائی ہے

بتاریخ ۲۳/ رمضان ۱۳۱۳ ہجری
رتھ جاترا مقرر ہے

یہ بات غور کرنے کے قابل ہے کہ جاترا کی تاریخ مسلمانوں کے سن ہجری میں دی گئی ہے جس سے اس وقت کی قومی یک جہتی کے ماحول کا اندازہ بہ خوبی کیا جاسکتا ہے۔

گردھاری پرشاد کو سنت مہاتماؤں اور بزرگان دین کی صحبت اور ان سے گفتگو کرنے کا بہت شوق تھا یہ بھی روایت ہمارے کلچر کی رہی ہے کہ مہاتماؤں کی صحبت سے فیض اور سکون قلب ملتا ہے۔

مانک پربھو مہاراج جو مانک نگر (تعلقہ ہمنا آباد ضلع گلبرگہ) میں قیام فرماتے تھے کے درشن کے لئے اور ان سے تنہائی میں گفتگو کرنے کے لئے گئے پرشاد میں ان کے کھڑاؤں لاکر دیول کیشو گیری کے احاطے میں مانک پربھو کی گدی بھی قائم کی۔

سوامی بھاسکر آنند سرسوتی مہاراج جو کاشی میں وشرام کرتے تھے بنسی راجہ ان کے بے حد معتقد تھے۔ سوامی جی کے آشیرواد سے آپ کے لڑکے نرسنگ راج کو جو کاشی میں سخت علیل ہوگئے تھے اور بچنے کی صورت نظر نہ آتی تھی اسی وقت بنسی راجہ نے نرسنگ راج کو سوامی کے قدموں میں ڈالدیا اور وہ صحت یاب ہوگئے۔ اسی لئے سوامی جی سے بے پناہ عقیدت کی بناء پر نرسنگ راج کی شادی بھی سوامی جی کی موجودگی میں کاشی میں فبروری ۱۸۹۶ء کو انجام پائی۔

وفات: گردھاری پرشاد کا انتقال طویل علالت کے بعد ۲۵/ جولائی ۱۸۹۶ء کو ان کی دیوڑھی (جو بنسی راجہ کی دیوڑھی کے نام سے مشہور تھی اور بارہ گلی حسینی علم میں واقع تھی) میں ہوا۔ ہندوؤں کی تتھی کے لحاظ سے ایکادشی اور آخری چہار شنبہ کا دن تھا۔

دوران علالت میر محبوب علی خاں مزاج پرسی کے لئے تشریف لائے ان کی آمد کی تاریخ باقی نے یوں قلمبند کی۔

بہ قصر پست باقیؔ قیصر عالی مقام آمد
زبہر عزت افزائی پشتینی غلام آمد

لسان شاعران ہاں ہاں برآمد فکر تاریخی
تو باقیؔ بے تکلف گو سواری نظام آمد

۱۳۱۳ ہجری

ہندوؤں کے عقیدے کے لحاظ سے مرنے سے قبل انھوں نے انشن برت رکھا۔ یعنے غذا و پانی کا استعمال ترک کر دیا۔

ان کی آنکھیں بند ہوئیں اور ہزاروں آنکھیں بہنے لگیں۔

چونکہ ان کا شمار امراء کے زمرے میں ہوتا تھا۔ لہذا بہ حکم سرکار نظام آخری رسومات ان کے بھتیجے راجہ سوامی پرشاد نے انجام دیں۔ کیونکہ ان کے بڑے فرزند راجہ نرسنگ راج کی عمر صرف آٹھ سال تھی۔ جنازے میں ہزاروں لوگ شریک تھے۔ ان کو خراج عقیدت پیش کرنے کے لئے ان کے احباب لکھنو۔ بھوپال اور حیدرآباد کے شعراء نے ایک یادگاری گلدستہ بہ عنوان آخرت باقی طبع کروایا مہاراجہ کشن پرشاد شادؔ نے ان الفاظ میں اپنے جذبات کا اظہار کیا۔

حیف از مردن بنسی راجہ در دکن ماند چو حسرت باقیؔ
ولے اے شادؔ سن فوتش گفت زجہاں رفت بہ جنت باقیؔ

فصیح الملک نواب مرزا خاں داغؔ نے اپنے غم کا اظہار اس طرح کیا۔

بیکنٹھ کو جب سدھارے راجہ ناگاہ کیا صدمہ و غم دل کو ہوا ہے جانکاہ
لکھ داغؔ یہہ سرگ باشی کا تو کرتا رہے باقیؔ اور فانی اے آہ

راجہ گردھاری پرشاد کی وراثت

راجہ گردھاری پرشاد کی وفات کے وقت ان کے دو فرزند راجہ نرسنگ راج عالیؔ اور رائے محبوب راج محبوبؔ بہت کم سن تھے۔ انکے سب سے بڑے فرزند راجہ کیشو پرشاد کا ۲۵ سال کی عمر میں ۱۸۸۷ء میں ہاتھی پر سے گرجانے سے انتقال ہوگیا تھا۔ نرسنگ راج کی تعلیم و تربیت بہت اعلیٰ پیمانہ پر کی گئی تھی۔ انھیں راجہ بہادر کے خطاب سے میر محبوب علی خاں نے اپنی سلور جوبلی کے جشن کے موقع پر سرفراز کیا۔ راجہ نرسنگ راج اردو ہندی اور فارسی کے پختہ مشق شاعر تھے۔ عالی تخلص فرماتے تھے۔ ایوان شاد کے مشاعروں میں شرکت کرتے اور حضرت جلیل کے شاگردوں میں خاص مقام رکھتے تھے۔ مہاراجہ کشن پرشاد کے دست راست کہلاتے تھے۔ ہندی میں بھجن لکھتے اور نرسنگ اپ نام تھا۔ غزلوں اور رباعیوں کا ایک ذخیرہ چھوڑ گئے۔ مذہبی رواداری ہندوستانی تہذیب اور روایات پر چلنا ان کی زندگی کا اہم جز تھا۔ مہاتماؤں اور مرشدان کامل کے درشن اور ان کی صحبت میں رہنا ان کی اولین ترجیح اور مصروفیت تھی کئی مہاتماوں کو حیدرآباد بلوایا اور بہت کچھ دان میں پیش کیا۔ اپنے والد کے نقش قدم پر چلتے ہوئے دیول کیشو گیری کی جاترا بہت اعلیٰ پیمانے پر کرتے تھے۔

اپنے والد کے استاد کا عرس بھی ہر سال انجام دیتے رہے۔ ایکادشی تتھی یعنے ۲۳ / جون ۱۹۵۷ء کو سرگ کو سدھارے۔

روح جب نکلی تو عالی رہ گئے اعضاء خموش * مالک خانہ کو جاتے پاسباں دیکھا کئے

مہاراجہ کشن پرشاد کی یاد میں ہر سال پرانی وضع پر طرحی مشاعرہ منعقد کرتے تھے۔ جو حیدرآباد کے مشاعروں کی تاریخ کا ایک باب ہے۔

راجہ نرسنگ راج کے بڑے فرزند رائے نرہر راج ساقیؔ بھی اردو کے شاعر تھے۔ اردو کے علاوہ ہندی میں بھی بھجن لکھتے تھے۔ مشترکہ تہذیب کی روایات کے ساری عمر پابند رہے۔ کئی عالیشان مشاعرے منعقد کئے حضرت جلیل کے شاگرد تھے۔ آپ کا

مختصر کلام بہ عنوان گل ہائے صد رنگ طبع ہو چکا ہے ۔ انھوں نے عثمانیہ یونیورسٹی میں بنسی راجہ گولڈ میڈل ایم اے ہندی میں اول آنے والے طالب علم کے لئے اجراء کروایا

رائے محبوب راج محبوب :۔ اردو اور ہندی میں شاعری فرماتے ۔ محبوب تخلص تھا راجہ گردھاری پرشاد کے سب سے چھوٹے فرزند تھے ۔ کہا جاتا ہے کہ آپ کا نام میر محبوب علی خاں کی حسب ارشاد ان کے نام پر رکھا گیا ۔

۳۸ سال کی عمر میں انتقال ہوا ۔ غزلیات کا کافی ذخیرہ چھوڑا ہے ۔ آپ اپنے حلقہء احباب اور رشتہ داروں میں بے حد ہر دلعزیز تھے ۔ مہاراجہ کشن پرشاد سے خاص لگاؤ تھا باقی نے مذہبی رواداری اور تہذیبی روایات کی جو بنیاد ڈالی وہ نسلاً در نسلاً جاری رہی ۔

تہذیبی و ادبی ماحول

" نواب میر محبوب علی خاں ۱۸ / اگست ۱۸۶۶ء کو پیدا ہوئے ۔ تین سال کی عمر میں ۲۶ / فبروری ۱۸۶۹ء کو مسند آرائے ریاست ہوئے ۔ آپ کی تعلیم و تربیت مختلف علوم و فنون میں مختلف اوقات میں مختلف ماہرین کے سپرد رہی ۔

آپ کے علم و فن اور شعر و سخن کی قدردانی کی وجہ سے علماء و فضلائے عصر اور مشہور شعرائے عہد کا مجمع شہر حیدرآباد میں ہو گیا تھا جو لکھنؤ اور دلی و نیز دیگر مقامات سے شہریار دکن کی فیاضیوں کی شہرت سن سن کر حیدرآباد چلے آئے تھے ۔ آپ کی علمی سرپرستی اور قدردانی کی وجہ سے لغت فرہنگ آصفیہ کی طباعت اور اشاعت ممکن ہو سکی ۔ اس کے علاوہ بیسیوں کاملان فن برابر فیضیاب ہوتے رہے ۔ آپ کے استاد سخن بلبل ہندوستان نواب مرزا خاں داغؔ کی شہرت کا ایسا عروج ہوا جو اس سے پیشتر کسی رئیس کی وجہ سے کسی شاعر کو میسر نہیں ہوا تھا ۔ میر محبوب علی خاں آصفؔ تخلص فرماتے تھے ۔ دو دیوان آپ کی یادگار ہیں ۔ ظاہر ہے کہ کلام میں داغ کا رنگ ہے ۔ نہایت سلیس ۔ فصیح اور بامحاورہ کلام ہوتا تھا جس میں حسن ظاہری کے ساتھ ساتھ حسن باطنی بھی بدرجہ اتم موجود ہے " ۔

راجہ گردھاری پرشاد باقیؔ نے جس دور میں اپنی تہذیبی و ادبی زندگی کا آغاز کیا وہ ہندو مسلم یگانگت اور خلوص کا دور تھا ۔ ادھر ادبی پس منظر میں زبان اردو اپنے ابتدائی ترقی کے مرحلے میں قدم رکھ چکی تھی ۔

چھٹے نظام میر محبوب علی خاں اور ان کے دیوان سر سالار جنگ نے اردو کو فارسی کی جگہ سرکاری زبان کا مرتبہ دے دیا تھا ۔ اس انقلابی اقدام نے ہندوستان کے مختلف حصوں سے اردو کے مشہور شاعروں ار ادیبوں کو حیدرآباد کو اپنی منزل مقصود بنانے کے لئے راغب کیا ۔ نتیجتاً حیدرآباد نہ صرف ادبی مرکز بنا بلکہ ہندوستانی تہذیب و تمدن کی چھوٹی سی راجدھانی بھی بن گیا ۔ مختلف علوم و فنون اور دیگر ہندوستانی زبانوں سے

ترجمہ اور تصنیف کا کام بھی یہاں ہونے لگا۔ کئی اردو اخبارات اور رسالہ جات بھی شائع ہونے لگے۔

یوں تو اردو زبان نے دکن میں قطب شاہی اور عادل شاہی دور ہی میں اپنے لیے ایک مقام پیدا کرلیا تھا۔ لیکن میر محبوب علی خاں کے زمانے میں ہندوستان کے مختلف حصوں سے اردو شعراء کی آمد اور اعلیٰ خدمات پر ماموری شروع ہوگئی۔ اسی طرح بنگالی اور مدراسی بھی یہاں اپنی قابلیت اور پیشہ ورانہ صلاحیتوں کی بناء پر آئے اور یہیں کے ہورہے۔ شعراء اور ادبا کی ایک طویل فہرست ہے اس فہرست میں سرفہرست ہیں داغ دہلوی جنھیں میر محبوب علی خاں آصف کی استادی کا شرف حاصل ہوا۔

مرزا داغ حضرت ذوق کے خاص شاگرد تھے جب دہلی کا دربار برخواست ہوا تو وہ رامپور گئے اور وہاں سے سن ۱۸۸۸ء میں حیدرآباد آئے۔

حیدرآباد پہنچنے پر راجہ گردھاری پرشاد باقیؔ نے آصف کے دربار میں پیش کیا۔

داغ کے بعد امیر مینائی بھی حیدرآباد آئے اور انھیں بھی باقی نے شاہ دکن کے دربار میں پیش کیا۔

حضرت شمس الدین فیضؔ کی رہنمائی میں اردو شاعری کی قدر و منزلت بڑھی اور جذبہ ذوق سخن کی ترقی ہورہی تھی۔ ان کی کاوشوں سے رئیس اور عوام دونوں طبقوں نے شاعری اور ادب کی ترقی کے لئے کمر کس لی۔

اردو کو سرکاری زبان کا درجہ ملنے سے بہت پہلے ہی مہاراجہ چندولال شادؔاں پیشکار سلطنت آصفیہ اپنی بارہ دری راج باغ میں ہر ماہ مشاعرہ منعقد کرتے اور شاعروں اور ادیبوں کی ہمت افزائی کرتے ان کے پرنواسے مہاراجہ کشن پرشاد شادؔ صدراعظم نے بھی یہہ سلسلہ جاری رکھا۔

گردھاری پرشاد باقیؔ راج باغ کے مشاعروں میں شرکت کیا کرتے تھے آہستہ آہستہ انھوں نے اپنے لیے ایک مقام حاصل کرلیا۔

حضرت فیضؔ اپنے دور کے استاد تھے ان کی شاعری سماجی، سیاسی و تہذیبی ماحول

کی عکاسی کرتی ہے ۔انھوں نے انگریزوں کے خلاف آواز اٹھائی اور لپنے ہم وطنوں میں خود اعتمادی اور جذبہ حب الوطنی پیدا کرنے کی ترغیب دی ۔

حیدرآباد دکن میں ہیں ہم * چین سے لپنے وطن میں ہیں ہم

باقؔی کا شمار فیضؔ کے خاص شاگردوں میں تھا ۔ وہ بھی گرو شیش یعنی استاد و شاگرد کی پرمپرا پر چلتے ہوئے حب الوطنی کے جذبے کا اظہار اسطرح کرتے ہیں ۔

حشر تک زندہ جاوید وہی باقؔی ہیں
طالب ملک بقا تھے جو فنا سے پہلے

گورنر جنرل ہندوستان نے سن ۱۸۷۷ء میں دہلی میں ایک دربار منعقد کیا تھا جس میں دیسی ریاستوں کے حکمرانوں کو بھی مدعو کیا گیا تھا باقی اس دربار میں میر محبوب علی خاں کے اسٹاف کے ایک رکن کی حیثیت سے شرکت کے لئے گئے ۔اس موقع پر انھوں نے فارسی میں ایک نظم لکھی جو انگریزوں کی حکمت عملی کے خلاف تھی جسے چھپوا کر تقسیم کیا گیا ۔ان کے سفرنامے کے مطابق اس نظم کی تعریف ہوئی ۔اس نظم کا خلاصہ سفرنامے کے باب میں شامل ہے ۔

فیض کے شاگردوں کی طویل فہرست ہے ۔اس میں ہندو مسلم دونوں شامل ہیں ۔ ان کے چند ہندو شاگردوں نے بھی استادی کا درجہ حاصل کیا ان میں بہاری لال رمزؔ، سیتل پرشاد خرمؔ بچولال تمکینؔ اور گردھاری پرشاد باقیؔ قابل ذکر ہیں ان کے مسلم شاگردوں میں مشرف جنگ فیاضؔ ۔ حفیظ الدین یاسؔ میر احمد علی عصرؔ مشہور ہوئے ۔

فیضؔ نے تقریباً ۵۰ سال حیدرآباد کی ادبی دنیا میں بہ حیثیت استاد لپنے شاگردوں کی رہنمائی کی اور عوام میں شاعری کا ذوق پیدا کیا ۔

گردھاری پرشاد کی شخصیت

ایک عالم ایک مدبر ایک محب وطن کی حیثیت سے بنسی راجہ ملک کے آسمان پر ایک ستارے کی طرح روشن رہے۔ وہ ہمہ گیر شخصیت کے مالک تھے اسی لئے اپنے ہی زمانے میں عظیم المرتبت رتبہ اور شہرت حاصل کی۔

اس وقت جب سالار جنگ اول کو ایک قابل اعتماد، باکردار قابل منتظم رفیق کار کی ضرورت تھی تاکہ وہ مملکت حیدرآباد کی فوجی تنظیم جدید اور صنعتی ترقی کے منصوبوں کو اپنی جدت طرازی اور اعلیٰ کارکردگی سے کچھ کر دکھائیں۔ مردم شناس نواب صاحب نے ان خصوصیات کو بنسی راجہ میں پایا کیونکہ وہ ایک وفادار صاحب احساس صاحب جدت انسان تھے۔ انھوں نے اپنی دوراندیشی اور باریک بینی سے کام لے کر سالار جنگ کے فوجی تنظیم کے منصوبوں کو عملی جامہ پہنایا تو دوسری جانب صنعتی کارخانے جات بنادیق، توپ و گولہ بارود و کاغذ، سادہ کاغذ اور اسٹامپ پیپر، چرم سازی قائم کر کے ملک کی صنعتی ترقی کے لئے غیر معمولی حوصلہ، ولولہ، بردباری، مستقل مزاجی سے مخالفت اور دشواریوں کے باوجود خود اعتمادی سے آگے بڑھنے کی ہمت سے کام کرتے رہے۔

نواب سالار جنگ اول نے بنسی راجہ کے سپرد اور بھی نازک کام کئے تھے اور وہ تھے شاہی محلات کے تمام مردانہ اور زنانہ تقریبات اور روزمرہ کے انتظامات اس کے علاوہ مغلائی دربار ہو یا انگریزی دربار اور دیگر رسومات کی انجام دہی۔

ان تمام انتظامات کے وہ افسر اعلیٰ تھے۔ جب تک سالار جنگ اول زندہ رہے وہ راست سالار جنگ سے منسلک رہے۔ ان کا کوئی شریک کار نہ تھا نواب صاحب کی وفات کے بعد وہ ہر تقریب اور ہر انتظام کے تعلق سے راست میر محبوب علی خاں کی تاکید اور حسب منشاء معقول اور مناسب انتظام کرتے تھے۔ (دیکھئیے صفحہ ۱۱۲)

اس ستارے کو غروب ہوے تقریباً ۱۰۰ سال کا عرصہ ہو رہا ہے۔ لیکن قدیم

حیدرآباد میں ان کی شہرت اور کارنامے ابھی تک بھی لوگوں کو یاد ہیں ان کی زندگی کے حالات کو خوردبینی نگاہ سے پرکھا جائے تو پتہ چلتا ہے کہ بنسی راجہ اپنے ملک اور سماج کے سچے بہی خواہ تھے۔ ان کی اعلیٰ کارکردگی، ادبی و تہذیبی کارنامے ضرب المثل تھے۔

ان کے ارادے مستقل اور نگاہ دور رس تھی۔ اس محب وطن کے حالات زندگی صحیح معنوں میں انفرادی جدوجہد، سنجیدہ کارناموں اور بے لوث وفاداری کی کہانی ہے۔

بنسی راجہ ان چند مدبرین، دانشوروں اور عالموں میں سے ہیں جو کسی ملک میں کبھی کبھی پیدا ہوتے ہیں اور جب بھی اتفاق سے پیدا ہوجاتے ہیں تو اپنے ملک کی ادبی تہذیبی و ثقافتی ترقی کے لئے کارہائے نمایاں انجام دیکر قوم کی شہرت و عظمت کو بام عروج تک پہنچادیتے ہیں جیسے جیسے زمانہ گزرتا جاتا ہے۔ ان بزرگ ہستیوں کی یاد نئی نسل کو دلانا ضروری ہے تاکہ ان صفات سے روشناس ہوکر نئی نسل میں بھی جذبہ حب الوطنی، مستقل مزاجی بردباری اور کام کرنے کا ولولہ اور آگے بڑھنے جانے کی ہمت پیدا ہوسکے۔

گردھاری پرشاد کی شخصیت ہمہ گیر تھی۔ انھوں نے جہاں دنیوی مصروفیات اور ذمہ داریوں کو ایک قابل، بااعتماد، دانشمند اور وفادار منتظم شخص کی حیثیت سے بخوبی انجام دیا وہیں دوسری طرف مذہبی اور روحانی اقدار کو تسلیم کرتے ہوئے ایک شاعر اور عالم کی حیثیت سے ایک مثالی ہندوستانی کا جیون گزارا۔ اس لئے ممکن ہوسکا کہ وہ ہندوستانی تہذیب کی روح یا آتما کو بخوبی جانتے تھے۔ تہذیب کی روح سے مراد ہے اقدار کا شعور اور وہ ترتیب جو ان میں اہمیت کے لحاظ سے قائم کی جائے۔

انھوں نے ہندوؤں اور مسلمانوں کی معاشرت، دینی و دنیوی تعلیمات اور رجحانات کا گہرا مطالعہ کیا تھا۔ یوں تو انھوں نے عملی طور پر تہذیبی و معاشرتی اقدار میں ہم آہنگی اور اشتراک پیدا کیا اور زندگی کو کامیاب اور مثالی بنایا اپنے ہی لئے نہیں بلکہ اپنے سماج کے لئے بھی۔ ان کے رجحانات اور جذبات اپنے زمانے کی ترجمانی کرتے ہیں

ان کی آنکھ اس وقت کے سماجی تقاضوں کی جانچ کر سکتی تھی اور ان کی زبان اپنے سماج کی زبان تھی۔ یہہ صرف ایک فن کار ہی کر سکتا ہے کیونکہ وہ پہلے اپنے ماحول کو اپنے اندر اتار لیتا ہے اور پھر خود اس پر چھا جاتا ہے۔

ان کے دل و دماغ پر وہ رنگ چھایا ہوا تھا جو سینکڑوں سالوں سے ہندوستان کے مذہبی، تہذیبی اور ادبی ماحول پر کہکشاں کی طرح درخشاں تھا۔ وہ ہندوستان کے فلسفہ حیات سے نہ صرف واقف تھے بلکہ اس کی خوبیوں کے قدردان تھے۔ ان کے دل میں نہ صرف ملک و مالک کی بلکہ ساری مخلوق کی محبت سمائی ہوئی تھی۔ جہاں تک دھرم یا مذہب کا تعلق ہے یہہ سچ ہے کہ وہ ہندو دھرم کے برمہہ سے اتنی ہی شردھا اور بھگتی رکھتے تھے جس قدر اسلام کے رحیم سے۔ انھوں نے اپنے قول و فعل سے یہہ سب پر عیاں کر دکھایا تھا۔ یہہ اس لئے ممکن ہو سکا کہ گردھاری پرشاد بنیادی طور پر بخوبی واقف تھے کہ ایک عام ہندوستانی ہندو ہو یا کہ مسلم اس کے دل کی گہرائی میں مذہب کا اتنا گہرا اثر ہے کہ وہ زندگی اور کائینات کا کوئی تصور قائم نہیں کر سکتا جس کی بنیاد مذہب پر نہ ہو۔ ہر ہندوستانی کے پاس مذہب کا مقام اخلاقی اقدار کے نظام میں وہی ہے جو دماغ کا انسان کے جسم میں ہوتا ہے۔

انسان، کائینات اور خدا ان تینوں کے باہمی تعلق کے بارے میں گردھاری پرشاد کی جدت یہہ ہے کہ جب وہ ہندی میں شاعری کرتے ہیں تو ان کے انسان کی زندگی کا مقصد وہی ہے جو ہندو بھگتوں کے پاس رہا تھا (تلسی داس یا سور داس کا) یعنے ایشور بھگتی۔ شخصی خدا جو رام یا کرشن کے روپ میں انسان سے جدا ہے۔ اس کی محبت یا عقیدت میں ڈوب جانا یا کھو جانا۔ ساتھ ہی ساتھ وہ ہندو ذہن کے اس فلسفۂ حیات سے بھی بخوبی واقف تھے جسے ویدانت میں برمہہ یعنے وجود مطلق کہا گیا ہے۔ انھوں نے اپنے بھجنوں اور کیشو پران اور شمبھو پران میں اس حقیقت کا صاف الفاظ میں ذکر کیا کہ بھگتی مارگ کے شخصی خدا اور ویدانت کے برمہہ میں کوئی فرق نہیں، ایک ہی حقیقت کے دو رخ ہیں۔ باقی کے فارسی کلام اور اردو کلام میں مسلمان صوفیوں کا گہرا اثر ملتا

ہے ۔ بہ الفاظ دیگر انھوں نے اس تجربے کو ایک انداز میں ہی سہی دہرایا ہے جو عہد وسطیٰ کے ہندو بھگتوں نے اور مسلمان صوفیوں نے باہمی اشتراک سے کر دکھایا تھا

اس طرح مذہب چاہے ہندو دھرم ہو یا اسلام باقیؔ صاحب کے نزدیک وہ روحانی اور اخلاقی رشتہ ہے جو انسان اپنے شخصی خدا یا وجود مطلق سے رکھتا ہے ۔ دراصل دھرم اور مذہب کا اصل مقصد یہی ہے کہ انسان کے دل میں وہ برتر شعور پیدا کر دے جو اسے موکش یا نجات دلائے یا خدا سے وابستہ کر دے ۔

ان کی ہندی تصنیفات کا اوپر ذکر کیا جا چکا ہے جن میں قابل ذکر ہیں ۔

بھاگوت سار یعنے بھاگوت کا خلاصہ ۔ بھاگوت میں دراصل بھگوان کرشن جی کی زندگی کے حالات بیان کئے گئے ہیں ۔ اس کے چند اشعار کو انتخاب کلام میں شامل کیا گیا ہے ۔ اور وہ سارے بھجن جو انھوں نے ہر مقام کی یاترا کے موقع پر لکھے تھے ان کی بھگتی اور شردھا کی ترجمانی کرتے ہیں ۔

فارسی میں انھوں نے رباعیات بابرکات لکھیں جو خدا کے ۹۹ اسمائے حسنیٰ پر مشتمل ہیں اور نعت بھی لکھی ۔ ان رباعیات کے مطالعہ کے بعد یہ ماننا کہ وہ ایک ہندو کی تخلیق ہے مشکل معلوم ہوتا ہے ۔

انھوں نے سلیس اور پر اثر سلام بھی لکھے ۔

ان کو تصوف سے خاص لگاؤ تھا ۔ شائد اس لئے کہ انؔ کے استاد حضرت فیض کے کلام میں بھی معرفت اور تصوف کا گہرا رنگ تھا ۔ حضرت فیضؔ کی ایک غزل جو ویدانت کے فلسفہ برمہہ سے متاثر نظر آتی ہے بہت مشہور ہوئی تھی اس کے چند اشعار حسب ذیل ہیں ۔

کریں ہم کس کی پوجا اور چڑھائیں کس کو چندن ہم
صنم ہم دیر ہم بت خانہ ہم بت ہم برہمن ہم

در و دیوار ہے نظروں میں اپنی آئینہ خانہ
کیا کرتے ہیں گھر بیٹھے ہی اپنا آپ درشن ہم

ہوا اے فیضؔ معلوم ایک مدت میں ہمیں تھے وہ
جپا کرتے تھے جس کے نام کی دن رات سمرن ہم

باقیؔ فرماتے ہیں۔

اپنی خلوت میں حال کھلتا ہے ہمیں
قال اپنی زبان سے شمع آسا ہے ہمیں

اس آئینہ خانۂ جہاں میں دیکھو
ہے اپنے ساتھ جو اشارہ ہے ہمیں

ہستی و عدم اسی کا میخانہ ہے
امکان وجوب جس کا پیمانہ ہے

گر دیدہ و دل تیرا حقیقت بیں ہو
ہر ذرہ خلق روزن خانہ ہے

مذہبی رواداری:۔ وہ اپنے مذہب کے پابند بلند نظر اور وسیع المشرب شخص تھے جہاں ہندو دھرم کے پابند تھے وہیں تصوف سے خاص لگاؤ تھا۔ اور تمام مذاہب کا احترام کرتے تھے۔

معروضہ برائے تولادان و زائچہ "محبوب علی پاشاہ" خودنوشتہ بنسی راجہ

محبوب علی پاشہ کا تولادان

انھوں نے محبوب علی پاشاہ کا تولادان ۱۸۹۳ء میں کروایا۔ گردھاری پرشاد علم جوتش میں بھی دخل رکھتے تھے۔ چنانچہ انھوں نے محبوب علی پاشاہ کا زائچہ بنایا اور ان کی درازی عمر اور خوشحالی کے لئے ضروری سمجھا کہ تولادان کروایا جاے۔

تولادان دراصل ایک قسم کی خیرات ہے۔ جس کسی شخص کے ستارے گردش میں ہوتے ہیں اسے کسی جنس یعنے چاول۔ گیہوں۔ تلی یا پھر تیل، گڑ، چاندی اور سونے میں تولا جاتا ہے اور اسے خیرات کے طور پر تقسیم کر دیا جاتا ہے۔ اس طریقہ کار میں مذہب کا دخل کم اور سماجی عقائد کا وزن زیادہ ہے۔

گردھاری پرشاد نے جب تولادان کی تجویز رکھی تو اس کی سخت مخالفت ہوئی۔ انھوں نے مخالفین کے شبہات دور کرنے کے لئے فارسی میں نظم لکھی جس کا خلاصہ یہہ تھا کہ خیرات کرنے کے لئے رسول خدا حضرت محمدؐ نے بھی تاکید کی ہے۔ اور جب خیرات حضور کی سلامتی اور درازی عمر کے لئے کسی بھی انداز میں کی جاے اس پر اعتراض نامناسب ہے۔

محبوب علی پاشاہ نے بعد اجازت والدہ تولادان کی اجازت دے دی اور شاہی محل میں تولادان انجام پایا۔ جہاں تک ہماری معلومات کا تعلق ہے آصفجاہی سلاطین میں صرف محبوب علی پاشاہ کا تولادان ہوا اسی طرح جیسے مغل بادشاہ اکبر کا ہوا تھا۔

(محبوب علی پاشاہ کا زائچہ اور تولادان کے لئے باقیؔ کا معروضہ صفحہ ۱۳۱ پر ملاحظہ فرمائیے)۔

ان کی دیوڑھی کے پاس حسین شاہ ولی کا مزار ہے ان کا عرس وہ ہر سال خود اپنے اخراجات سے کرتے۔ اسی طرح اپنے استاد محمد علی عاشقؔ کا بھی عرس انجام دیتے تھے۔

کسی بھی مسلمان درویش کے حیدرآباد آنے پر ان کی خاطر تواضع میں کوئی دریغ نہیں کرتے تھے۔

وہ اپنی وضع کے نہایت پابند تھے۔ لباس میں ہمیشہ یکساں روش قائم رکھی۔

قدیم لباس جامہ و نیمہ پہنتے تھے ۔ایک مرتبہ رزیڈنٹ حیدرآباد نے دربار انگریزی کے موقع پر کہا کہ "راجہ صاحب آپ یہہ لباس کیوں پہنتے ہیں یہہ تو ہماری لیڈیز کا لباس ہے" ۔انھوں نے برجستہ جواب دیا" صاحب یہہ لیڈیز کا لباس نہیں بلکہ آپ کے مرشد و رہنمائے دین یعنے پادریوں کا لباس ہے"۔

وہ موسیقی، خطاطی اور بنوٹ میں کافی مہارت رکھتے تھے ۔ پکوان کے مختلف طریقوں سے بھی واقف تھے۔ مشغلہ کے طور پر اپنے ہاتھ سے کھانے پکاتے اور میر محبوب علی خاں، سالار جنگ اور دوسرے احباب اور دوستوں کو بھیج کر خراج تحسین وصول کرتے تھے ۔اس دور کے امرائے عظام سے ان کے بہت خوشگوار تعلقات رہے۔

نواب سالار جنگ اول نے ان کے اور نواب شمس الامراء کے درمیان اختلافات اور بدگمانیوں کو دور کرنے کے لئے گردھاری پرشاد کو ثالث مقرر کیا۔ گردھاری پرشاد نے اس نازک کام کی ذمہ داری لینی نہ چاہی ۔ کیونکہ ان کے اور سالار جنگ کے ۳۰ سال سے قریبی تعلقات رہے تھے اور ان کو شبہ تھا کہ اس خدمت کو قبول کرنے سے تعلقات بگڑ سکتے ہیں ۔اس عذر کے جواب میں سالار جنگ نے ان کو یقین دلایا کہ ایسا کبھی نہیں ہوگا اور دیگر یہہ کہ اس نازک اور اہم فرض کو ادا کرنے کے لئے بنسی راجہ کے سوائے کوئی اور نہ موزوں ہے اور نہ ایسی صلاحیت رکھتا ہے۔ چنانچہ اس کام کو انہوں نے بہ حسن وخوبی انجام دیا۔

یہہ فرض اس لئے نازک تھا کہ سالار جنگ اور شمس الامراء اس دور کے اور سلطنت آصفیہ کے دو اہم ستون تھے ۔ان کے درمیان ہم آہنگی اور اتحاد کو بحال کرنے کا کام ایک غیر معمولی صلاحیتوں کا حامل فرد ہی کر سکتا تھا۔

باقیؔ کو فی البدیہ اشعار کہنے کی بھی بڑی مہارت حاصل تھی ۔ عموماً میر محبوب علی خاں کوئی مصرع کہتے تھے اور باقی سے اسی وقت مصرع ثانی کہنے کی خواہش کرتے تھے۔ چنانچہ ایک مرتبہ یہ مصرع فرمایا اور اس پر مصرع اولیٰ کہنے کی فرمائش کی مصرع تھا:

میر محبوب علی خاں کو نہیں جانتے کیا

باقیؔ نے فی البدیہہ یہ مصرع کہا:

پوچھتے کیا ہو کہ آصفؔ ہے تخلص کس کا میر محبوب علی خاں کو نہیں جانتے کیا

یہہ مصرعہ سن کر محبوب علی پاشاہ بہت خوش ہوئے اور اسے اپنی غزل میں شامل کرلیا۔
یوں تو میر محبوب علی خاں کے دور حکومت میں مذہبی فسادات اور جھگڑوں سے سیاسی فضاء کم و بیش پاک و صاف تھی۔ لیکن کبھی کبھار ایک دو واقعات پیش آ گئے۔
ایک دفعہ محرم کے جلوس کے بعد سلطان نواز جنگ کے عرب سپاہیوں نے پولیس کے جوانوں پر حملہ کیا اور عربوں نے سات (۷) سپاہیوں کا قتل کردیا۔ اس کی سزاء میں سلطان نواز جنگ کو شہر بدر کا حکم صادر ہوا۔ یہہ حکم راجہ گردھاری پرشاد کے ذریعے سلطان نواز جنگ کو بھیجا گیا۔ حکم بھیجنے سے پہلے افسر جنگ کمانڈر فوج حیدرآباد نے مکہ مسجد کے مغربی حصار پر توپ نصب کردی تھی تاکہ ضرورت پڑنے پر سلطان نواز جنگ کی دیوڑھی پر داغ دی جاے۔ ان کی دیوڑھی مکہ مسجد کے شمال مغرب میں واقع تھی۔
سرکاری فرمان لیکر جب بنسی راجہ سلطان نواز جنگ کے پاس گئے اور انھیں سمجھایا کہ وہ اس نازیبا حرکت کے لئے سرکار سے معافی مانگ لیں۔ تو سلطان نواز جنگ نے اپنی پگڑی اتار کر گردھاری پرشاد کے قدموں پر رکھ دی اور ان سے استدعا کی کہ انھیں سات (۷) دن کی مہلت دلوادیں وہ شہر سے چلے جائیں گے چنانچہ گردھاری پرشاد نے انھیں مہلت دلوادی۔
اس واقعہ سے یہہ واضح ہے کہ گردھاری پرشاد پر حاکم وقت کو کتنا اعتماد تھا دوسری جانب عرب ان کی عزت کرتے تھے چونکہ وہ عربی زبان جانتے تھے۔ شرعی قوانین سے واقف تھے اور جمعیت نظام محبوب کی تشکیل کے وقت انھوں نے عربوں کی تربیت کا معقول انتظام کروایا تھا۔ وہ امن پسند اور صلح کن شخصیت کے مالک تھے۔ اس لئے یہہ ذمہ داری ان کے سپرد کی گئی۔

ان پر محبوب علی پاشاہ کے اعتماد کا ایک اور اہم واقعہ یہہ ہے کہ محبوب علی پاشاہ اپنی بہن نجیب النساء دختراللہ رکھی بیگم کی شادی لیاقت علی خاں فرزند سرسالار جنگ اول کیساتھ طے کرنا چاہتے تھے۔یہہ مسئلہ نازک اس لئے تھا کہ سلاطین آصف جاہی سنی تھے اور سالار جنگ شیعہ۔

دوسری نزاکت یہہ تھی کہ میر محبوب علی خاں اچھی طرح جانتے تھے کہ ان کی والدہ اللہ رکھی بیگم اور ان کی دادی دلاور انساء بیگم بہت کٹر سنی تھیں۔ان دونوں کو راضی کرنا بہت مشکل کام تھا اس لئے محبوب علی خاں نے گردھاری پرشاد سے کہا تھا کہ وہ فوری اس شادی کا اعلان سیاہیہ میں کردیں بغیر ان دونوں بیگمات کی اجازت لئے۔ لیکن گردھاری پرشاد نے بڑی جراءت کے ساتھ بادشاہ وقت سے کہا کہ ایسا کرنا نامناسب ہے۔اور اسطرح میر محبوب علی خاں اور ان کی سوتیلی والدہ کے تعلقات میں کشیدگی پیدا ہونے نہیں دی۔دوسری جانب بادشاہ وقت سے یہہ بھی عرض کیا کہ بغیر بزرگوں کی اجازت لئے شادی جیسا زندگی کا اہم فریضہ انجام دینا ہندوستانی تہذیبی روایات کے خلاف ہے۔آخر کار یہہ شادی خورشید جاہ کے فرزند کے ساتھ گردھاری پرشاد کی نگرانی میں انجام پائی۔شادی کی تمام تقریبات کی تفصیلات گردھاری پرشاد نے اپنے روزنامچے میں درج کی تھیں۔(اس کو کتاب کی شکل دے کر بعنوان شاہی شادی، اتیچ ای اتیچ دی نظام اردو ٹرسٹ نے ۱۹۹۳ء میں شائع کرا دیا۔مترجم ڈاکٹر شیلا راج)

افقؔ لکھنوی کے فرزند بشیویشور پرشاد منورؔ لکھنوی نے لمعات افقؔ میں گردھاری پرشاد کی شخصیت کے ایک اور پہلو پر روشنی ڈالی ہے:

"حیدرآباد دکن کے راجہ گردھاری پرشاد باقیؔ والد صاحب کے خاص قدردان اور مربی تھے۔"نظم" اخبار انھیں کی سرپرستی میں نکلا۔لکھنؤ پریس بھی انھیں کی یادگار میں قائم ہوا۔والد صاحب کو انھیں کے اثر و رسوخ سے طلب کیا گیا اور نظام دکن کی بارگاہ عالی تک ان کی رسائی باقی کے توسل سے ہوئی۔

حیدرآباد دکن سے واپسی پر اپنا سفرنامہ نظم اخبار میں مسلسل شائع کیا۔مارچ

۱۸۹۰ء کے شمارہ میں اس سفرنامہ کا آخری حصہ شائع ہوا"۔
بہ حیثیت ایک شاعر اور عالم وہ شاعروں اور عالموں کے قدردان بھی تھے اور ان کی کسی نہ کسی شکل میں امداد اور ہمت افزائی بھی کیا کرتے تھے۔

عام طور پر عوامی زندگی کے تعلق سے بنسی راجہ اور راجہ شیوراج دھرم ونت کا درجہ برابری کا تھا کیونکہ یہ دونوں عظیم شخصیتیں حکومت حیدرآباد سے ہندوؤں کے مفادات اور ہندوؤں کی سماجی اور سرکاری خدمات کے سلسلے میں نمائندگی کیا کرتی تھیں۔ جب کبھی کوئی پیچیدہ مسئلہ کھڑا ہوتا تو وہ حکومت کی طرف سے بھی عوام کو سمجھانے کے لئے حکومت کی نمائندگی بھی کرتے تھے۔

۱۸۹۰ء-۹۱ میں حکومت حیدرآباد ہندو طلباء کو اسکالرشپ دیکر بیرونی ممالک جیسے انگلستان وغیرہ بھیجنے کے لئے مدعو کر رہی تھی تو اس کمیٹی میں راجہ شیوراج اور بنسی راجہ نے ہندوؤں کی نمائندگی کی تھی۔

بنسی راجہ "رپن میموریل کمیٹی" کی مینجنگ کمیٹی کے رکن بھی تھے۔ بنسی راجہ کی رنگارنگ شخصیت نے قدیم روایات اور نئے رجحانات کے درمیان ایک مصلحت کن انداز سے اپنے فرائض انجام دیئے۔

سرورالملک بنسی راجہ کے ہم عصر تھے اور وہ بھی محبوب علی پاشاہ کے اتالیق تھے وہ اپنی سوانح عمری میں بنسی راجہ کی شخصیت کے تعلق سے اس طرح رقم طراز ہیں:

> " ماہ صفر میں سونے اور چاندی کے چھلے امراء اور دیگر مصاحبین کو تقسیم کئے جاتے تھے بنسی راجہ نے مجھے سات چھلے روانہ کئے رجب کے مہینے میں مجھے بنسی راجہ کے پاس سے دعوت نامہ وصول ہوا۔ کنڈوں کی فاتحہ کی دعوت کا جو امام جعفر صادق کی یاد میں خلوت مبارک میں ہوتی تھی۔ اس دعوت میں سوائے امرائے عظام کے سب رئیس معززین شہر مدعو کئے جاتے تھے۔ بریانی و مزعفر کھانے کے بعد ہر شخص حضور کی شہ نشین تک جاتا اور شکرانہ کا آداب بجالا کر رخصت ہوتا تھا

بنسی راجہ اپنے خاندانی لباس انگر کھا (یعنے ڈھگلا) تمان اور خاندانی پگڑی میں ملبوس مہمانوں کی خاطر تواضع میں مصروف رہتے تھے۔شب برات میں آتش بازی کی تقسیم ، عیدنوروز کی تقریب عیدالضحیٰ میں اونٹ کے گوشت کی تقسیم...... ان سب کا اہتمام بہ خوبی ان کے ذریعہ انجام پاتا تھا"۔

۹رمحرم کو لنگر کا جلوس نکلتا تھا۔ بنسی راجہ عماری میں سوار اس جلوس کی قیادت کرتے تھے۔

ماہ رمضان میں وہ افطار کی دعوت اپنی دیوڑھی میں منعقد کرتے تھے۔

مملکت آصفیہ کی فوج کی تنظیم نو و کارخانہ جات کے قیام میں

بنسی راجہ کارول

سالار جنگ اول مئی ۱۸۵۳ء میں دیوان مقرر ہوئے ۔جب انھوں نے یہہ ذمہ داری سنبھالی اس وقت سلطنت کا نظم و نسق فوج و پولیس اور مالیہ یعنے ہر محکمہ کی کارکردگی غیر اطمینان بخش اور ناکارہ تھی ۔روز اول سے سالار جنگ نے یہہ فیصلہ کیا تھا کہ ہر شعبہ و محکمے کی تنظیم جدید طریقوں سے کی جائے گی۔

۱۸۵۷ء کے غدر کے بعد آخری مغلیہ بادشاہ بہادر شاہ ظفر گرفتار کرلیے گئے اور مغلیہ سلطنت کا خاتمہ ہوا تو دوسری جانب دیسی ریاستوں کے حکمران انگریزوں کے اطاعت گزار ہوگئے ۔نظام حیدرآباد نواب افضل الدولہ اور ان کے دیوان سالار جنگ اول نے انگریزوں سے اپنے مراسم مضبوط کئے اور ان سے اشتراک ان کی حکومت کی حکمت عملی تھی ۔فبروری 1869ء میں افضل الدولہ کا انتقال ہوا اس وقت ان کے کم سن شہزادے میر محبوب علی خاں کی عمر صرف تین سال تھی ۔اس وجہہ سے سالار جنگ ریجنٹ مقرر کئے گئے ۔لیکن انگریزوں کو سالار جنگ اول پر مکمل اعتماد نہ تھا ۔اس کی وجہہ یہہ تھی کہ سالار جنگ بہت زور و شور سے علاقہ برار (جو آجکل ودربھا کے نام سے مہاراشٹر کا علاقہ ہے) کو واپس حاصل کرنے کی کوشش کررہے تھے۔

سن ۱۷۹۸ء میں برٹش فوج کے لئے سکندرآباد میں چھاونی قائم کی گئی ۔۱۸۰۰ء میں اسے اور وسعت دی گئی ۔اس برٹش فوج کے اخراجات کے لئے علاقہ برار کو ۱۸۵۳ء کے معاہدے کے تحت سراج الملک (دیوان وقت) نے برطانوی سرکار کے حوالے کردیا۔ (سراج الملک نواب سالار جنگ کے چچا تھے)۔

سالار جنگ اول کی یہہ حکمت عملی تھی کہ جہاں تک ہوسکے اپنی سلطنت کے اندرونی معاملات میں انگریزوں کو دخل انداز نہ ہونے دیا جائے نواب صاحب نے اپنے

ہی اندرونی وسائل کو استعمال کرتے ہوئے صنعتی ترقی کی جانب عملی اقدام بھی اٹھائے تاکہ درآمدات پر کم سے کم زرمبادلہ صرف ہو۔

فوج یعنے فوج باقاعدہ کی تشکیل کو عملی جامہ پہنانے کے لئے انھوں نے بنسی راجہ کو منتخب کیا۔ سالار جنگ اول ایک مردم شناس شخص تھے انھوں نے بنسی راجہ کی شخصیت میں غیر معمولی اوصاف جیسے جدت پسندی، قومی بھلائی اور بہبودی، منتظم شخصیت اور قابل اعتماد شخص ہونے کے باعث مناسب و موزوں سمجھا۔

اس بات کا پہلے ہی ذکر کیا جاچکا ہے کہ سن ۱۸۵۰ء میں بنسی راجہ نے نواب رونق علی خاں کی فوج میں پھیلی بدامنی اور بغاوت کو سرکرنے میں غیر معمولی حکمت عملی اور سوجھ بوجھ کا ثبوت دیا تھا۔

پھر ۱۸۵۷ء میں افغان فوج نے جو بغاوت کا جھنڈا اٹھایا تو اس کی سرکشی کے لئے بھی سالار جنگ نے بنسی راجہ کی خدمات حاصل کیں۔ ان وجوہات کی بناء پر راجہ صاحب کو فوج باقاعدہ کی تنظیم کی ذمہ داری سن 1864ء میں سونپی گئی۔

راجہ ممدوح نے سمستھان و نپرتی کی فوج کے سپاہیوں کو باضابطہ ٹریننگ دلوائی اور فوج باقاعدہ کو منظم کیا جو فوج کے دستے اپنے معیار اور صلاحیت کی بناء پر فوج باقاعدہ میں شامل نہیں کئے گئے ان کی فوج بے قاعدہ کی شکل میں تشکیل عمل میں آئی۔ ۱۸۷۰ء میں بنسی راجہ نے عرب فوج کو یوروپین ماہرین سے ٹریننگ دلواکر جمعیت نظام محبوب (میسرم رجمنٹ) قائم کی۔

ان کی اس غیر معمولی کارکردگی اور اعلیٰ ترین دور اندیشی کے کارناموں کو ملحوظ رکھتے ہوئے انھیں۔ صدر سررشتہ دار فوج باقاعدہ و بے قاعدہ کے نئے عہدے پر فائز کیا گیا اس کے علاوہ وہ جمعیت نظام محبوب کے سررشتہ دار بھی مقرر ہوئے۔

حیات باقیؔ کے مصنف افقؔ لکھنوی اپنی تصنیف حیات باقیؔ منظوم میں فوج کی تنظیم اور کارناموں کا ذکر ان الفاظ میں کرتے ہیں۔

بافواج پولیس چون شد مقرر مسلح کردن از بندوق بہتر
بحکمش باقے فرخندہ بنیاد بصنعت کارخانہ کرد لیجاد
بنادیقش پسند عام گشتند چومی بینی بت گلفام گشتند
صنائی آنہا آزمودند زحیرت جملہ انگریزان ستودند
دکن را فخر بیش از بیش گشتہ کہ انگلستان زدانائیش گشتہ
ہم از حکم خداوند مجازی نمود او حصہء خود کیپ سازی
درینجا قاریاں مطلب بدانند کہ انگریزاں بہ ٹوپی کیپ خوانند
کلہ دانستن از سرغلط ہست پے بندوق این ٹوپی فقط ہست
پے اسٹامپ از خوبی بسیار بحکم شاہ کاغذ کردہ تیار

کارخانہ توپ و بنادیق:۔ سن ۱۸۶۵ء میں فوج کو بنادیق اور اسلحہ کی سپلائی کے لئے بنسی راجہ نے بنادیق بنانے کا کارخانہ سالار جنگ اول کی لماء پر قائم کیا۔ کارخانہ بنادیق و توپ بہ مقام بالاپور چندرائین گٹہ قائم ہوا۔ بنسی راجہ نے اپنی تصنیف کنوز التواریخ میں لکھا ہے کارخانہ بنادیق اور بارود کا سالانہ بجٹ بیس لاکھ روپیہ سکہ حالی تھا۔ تیار کردہ بنادیق اور بارود کے معیار کی وقتاً فوقتاً جانچ کی جاتی تھی۔ اور اس کام کے لئے فوج کے عہدہ داروں کی ایک کمیٹی تشکیل پائی تھی جو بعد معائنیہ تیار شدہ بنادیق، رائفل اور تلوار کیساتھ بننے والے اسلحہ کا معائنیہ سالار جنگ اول بھی کیا کرتے تھے۔ کارخانہ بنادیق اور بارود کا نام صنائع دکن تھا۔ نواب سالار جنگ اول اس کارخانہ کی تیار شدہ بندوق اپنے ہمراہ ولایت لے گئے تھے۔ وہاں اس کا معائنیہ کیا گیا امتحان لیا گیا اور بہت پسند کی گئی۔

۱۸۷۷ء اور ۱۸۷۸ء تک تقریباً ۲۰ ہزار بنادیق بنائے گئے تھے جو فوج کو سپلائی کئے گئے۔

بنسی راجہ کے کارخانہ بنادیق اور بارود کی مخبری کسی انگریز نے سکریٹری آف اسٹیٹ لندن کو دی۔ سکریٹری نے ٹیلگرام کے ذریعہ وائسرائے ہند سے خواہش کی کہ وہ فوراً اس بات کی تحقیقات کریں کہ بنسی راجہ نے یہہ کارخانے کسطرح قائم کئے تاکہ ان کے خلاف قانونی کاروائی کی جاسکے۔

تحقیقات کے لئے میجر EVAN SMITH جو ریذیڈنٹ حیدرآباد کے ملٹری سکریٹری تھے بھیجے گئے تھے۔ انھوں نے جو رپورٹ بھیجی اس کا خلاصہ اسطرح سے ہے :-

" بنسی راجہ ایک نہایت ہی مہذب کایستھ ہندو ہیں انھوں نے باخوشی و رضامندی مجھے اپنے کارخانے کا معائنیہ کرنے دیا۔ معائینے کے وقت وہ خود موجود تھے۔
بنسی راجہ ایک غیر معمولی شخصیت کے مالک ہیں۔ سالار جنگ سنگین اور نازک مسائل کو حل کرنے کے لئے ان کی صلاحیت پر منحصر رہتے ہیں حیدرآباد کی فوج کی تنظیم اور تشکیل کے لئے انھوں نے بہت نمایاں خدمات انجام دی ہیں۔
انھوں نے کارخانہ بنادیق دس سال قبل قائم کیا۔ سالار جنگ نے یہہ کارخانہ قائم کرنے کے لئے برٹش سرکار سے اجازت نہیں لی۔
بنسی راجہ اس کارخانے کے مینجر ہیں اور قریب ۴۵۰ ملازمین اس کارخانے میں کام کرتے ہیں۔ ان میں سے بہت سے تربیت یافتہ ہیں تقریباً ۵۰۰ پانچ سو بنادیق ہر ماہ تیار ہوتی ہیں۔ اس کارخانے میں اب تک تقریباً ۲۰ ہزار بنادیق تیار کی جاچکی ہیں جو فوج اور مقامی پولیس کو سربراہ کی گئیں۔
اس کارخانے میں چند Heny Martin Riffles بھی تیار کی جاچکی ہیں جو عمدہ قسم کی ہیں۔
ہنری مسکٹ کیساتھ تلوار بھی بنائی جاتی ہے۔ ایک ہنری مسکٹ کی قیمت ۴۴ روپیے سکہ حالی ہے "۔

اس سے قبل ریذیڈنٹ حیدرآباد نے ایک رپورٹ ۱۸۷۵ء میں روانہ کی۔
۱۰ / اگسٹ ۱۸۷۷ء کو کرنل فریسر Colonel FARSER نے بنسی راجہ کے کارخانوں کا معائنیہ کیا۔ انھوں نے اپنی رپورٹ میں لکھا کہ " بنسی راجہ نے نظام کے لئے ایک خالص سونے کا Riffle تیار کیا جو چلانے میں بہت آسان اور کارگر ہے۔
Winchester Rifles کے علاوہ Henry Martin Riffles بھی بنائے جاتے ہیں۔
اس کے علاوہ بارود اور توپ کے گولے بنانے کا کارخانہ بھی قائم ہے۔

کارخانوں کا انتظام اور کارکردگی معقول اور اطمینان بخش ہے۔

بنسی راجہ نے انگلستان سے بہت قیمتی اور عمدہ قسم کی مشینری درآمد کی ہے بمبئی کے بہت سے Clearing Agents نے مشینری کی درآمد میں ان کی مدد کی۔ بہت ساری مشینری ابھی کھولی بھی نہیں گئی۔ سرمیڈ ریذیڈنٹ (Sir S.R. Meade) حیدرآباد نے سالارجنگ اول کو طلب کیا اور ان سے بنسی راجہ کے کارخانوں اور فوج کی تنظیم کے بارے میں پوچھ تاچھ کی۔ سرمیڈ نے نواب صاحب سے کہا کہ ۱۸۵۳ء کے معاہدے کی روشنی میں سالارجنگ کا فرض تھا کہ وہ برٹش سرکار سے اجازت لے کر ہی یہہ کارخانے قائم کرتے۔ ریذیڈنٹ نے نواب صاحب سے مطالبہ کیا وہ تحریراً اس بات کا اقرار کریں کہ ان کارخانوں کو فوراً بند کروادئیں گے۔ اور فوج کی تنظیم جدید کے دوسرے منصوبوں کو ملتوی کردیں گے۔ اسی دوران سالارجنگ کی مدت بہ حیثیت Co-Regent ختم ہونے والی تھی۔ انھیں برٹش سرکار نے لندن آنے کی دعوت دی وہاں جانے پر نواب صاحب کو صاف الفاظ میں کہدیا گیا کہ وہ اسلحہ سازی اور بارود کے کارخانے جات بند کردیں۔ پیام صاف تھا۔ سالارجنگ کو برٹش سرکار کے آگے جھکنا پڑا۔

بنسی راجہ اور نواب سالارجنگ کے مکمل اشتراک اور ایک دوسرے پر اعتماد اور حکمت عملی سے یہہ حقیقت سامنے آتی ہے کہ دیسی ریاستوں میں ایسی شخصیتیں موجود تھیں جو اپنے وطن و علاقہ کو خود مکتفی اور اپنی جدت سے صنعتی ترقی کے ذریعے معاشی خوشحالی کے منصوبے بناتی تھیں۔ لیکن انگریز یہہ کبھی نہیں چاہتے تھے کہ دیسی ریاستوں کو فرداً فرداً اور پورے ہندوستان کو بہ حیثیت مجموعی صنعتی اور معاشی ترقی کا موقع دیا جائے۔ اس پالیسی کے تحت سالارجنگ اور بنسی راجہ کو مجبوراً کارخانے بند کردینے پڑے۔

ان کے علاوہ حسب ذیل کارخانے بنسی راجہ نے قائم کئے۔

کارخانہ چرم یعنی Leather :۔ فوجی سپاہیوں کو Belts بنانے کے لئے چمڑہ تیار کیا جاتا تھا۔

کارخانہ کاغذ بالاپور:۔ ۱۸۷۷ء میں بہ مقام بالاپور قریب چنارائی گٹہ راجہ

گردھاری پرشاد نے کاغذ کا کارخانہ قائم کیا اس میں بھاپ کے انجن کے ذریعے سے کام کیا جاتا تھا۔ جس سے کاغذ تیار ہوتا تھا۔ وہ سرکاری دفاتر میں کام آتا تھا۔ اور بازار میں فروخت ہوتا تھا۔ یہ نہایت ہی عمدہ اور مضبوط تھا۔

معمولی سادہ سفید کاغذ کے علاوہ مہمور (Stamp Paper) کے لئے بھی یہاں کاغذ تیار کیا جاتا تھا۔ ۳۔ ۴ سال تک اسی کارخانہ میں کاغذ مہمور چھپتا رہا۔ نواب سالار جنگ نے بھی اس کا معائنہ فرمایا۔ چند روز بعد دفاتر کے لئے Stamp Paper اور سادہ کاغذ انگلستان سے آنا شروع ہوا۔ کیونکہ انگریز سرکار نے درآمدہ کاغذ پر ڈیوٹی کم کردی۔ جس سے باہر سے آنے والے کاغذ کا دام یہاں بننے والے کاغذ کے دام سے کم ہوگیا۔ اور اس کارخانہ میں بنا ہوا کاغذ جوں کا توں پڑا رہنے لگا۔ بالآخر 1890ء میں یہ کارخانہ بند ہوگیا۔ اس کارخانہ میں جو کاغذ تیار ہوتا تھا وہ پائیداری کے علاوہ صاف (صفائی)۔ چکناپن و مضبوطی میں بھی بے مثل تھا۔

کارخانہ باراگلی:۔ ۱۸۶۵ء میں کارخانہ پٹاخہ ——— بنسی راجہ نے محلہ باراگلی میں قائم کیا۔ اور اس کا نام مدرسہ صناعی رکھا۔ اس کارخانہ میں بھاپ سے چلنے والے مشین سے کام لیا جاتا تھا۔ اس مشین کو لگانے کا صرفہ ۲ لاکھ روپیہ ہوا تھا۔

کپڑے سینے کا کارخانہ:۔ 68-1867ء میں یہاں کپڑے سینے کا کارخانہ قائم کیا اور یہ شہر حیدرآباد میں مشین سے کپڑے سلوانے کی ابتداء تھی۔ اس کارخانہ کے ذریعے فوجیوں کو ٹوپیاں بھی سپلائی کی جاتی تھیں۔

کاریگروں کی تنخواہ پر ماہانہ ۲۰ ہزار روپیہ صرف ہوا کرتا تھا۔

گنپتی وندنا *

نمو نمو گنپت رایا
شیو کے پتر اما کے جایا
سرپ کرن لمبودر نائک وکر تنڈ سنکل سکھہ دایا
جگ میں ہوم ہوتی جن کینو آد گیانن کے گن گایا
وگھن ہرن کو دیہان دہر لو جن ردہی سدھی سکھ سنپت پایا
پرتھم تم پوجا کے پھل سون منگل کارج شبھ بن آیا
گردہاری پربھو چرنن چت دے
بھو بادہا سب دور دور آیا

○

گرونانک کے دربار کی شان میں **

گورو دربار بار جن پایو جگ میں بڑ بھاگے کہلایو
جیون مکتی پایو رے بھائی جو نر امرت سر سرن آیو
یا کی مہما کہہ مکھ برنون پرتھوی میں ایک سرگ لکھایو
جہاں ایک ایک گرنتھی سندر آٹھ پہر گرو شبد سنایو
گردھاری ہرداس کیو جب ہرداسن میں نام لکھایو
راجہ نریندر رہیں دکھن میں بار بار یہہ استت گایو

---

* توشہ عاقبت ۔ باقی نے سفرنامے کی شروعات گنپتی وندنا لکھ کر کی تھی

** ہرمندر صاحب میں یہہ بھجن لکھ کر ربابی سے گوایا تھا۔

"توشہء عاقبت"

(بنسی راجہ کے سفرنامے)

تیرتھ اس مقام کو کہتے ہیں جہاں بزرگان دین یعنے مہاتما یا گرو مقیم رہتے ہیں عموماً گرو جس مقام پر اپنے رہنے کے لئے رہائش گاہ بناتے ہیں اسے آشرم کہا جاتا ہے ۔ جب یاتری مذہبی معلومات حاصل کرنے آئے اس کی گرو رہنمائی کرتے ہیں ۔ عام طور پر رشی منیوں کے آشرم (خانقاہیں) کسی مقدس تیرتھ استھان پر ہوا کرتی تھیں ۔ مہابھارت میں تاکید کی گئی ہے کہ یگنہ کرنے سے زیادہ آسان تیرتھ یاترا پر جانا ہے ۔ کیونکہ یگنہ کرنے کے لئے جتنی رقم اور دیگر اشیاء کی ضرورت ہوتی ہے وہ ہر شخص کے بس کا روگ نہیں ۔ لیکن ہر شخص تیرتھ یاترا پر جاسکتا ہے ۔ اس لئے تیرتھ یاترا پر جانے کی اہمیت پر زور دیا گیا ہے ۔ شائید اس لئے بھی کہ تیرتھ پر جانے سے ہر ہندوستانی اپنے ملک کے مختلف مقامات اور وہاں کے عوام سے واقف ہو سکتا ہے ۔ جس سے قومی یک جہتی کو بنائے رکھنے میں مدد ملتی ہے اور لسانی اور علاقائی تنگ نظری کا جذبہ ابھرنے نہیں پاتا ۔ اس طرح قومی یگانگت کو روحانی درجہ دیا گیا تیرتھ یاترا پر جانے کے چند قواعد ہیں اور ان کی پابندی ضروری ہے ۔ مثال کے طور پر شادی شدہ شوہر کا فرض ہے کہ وہ اپنی بیوی یا دھرم پتنی کو ساتھ یاترا پر لے جائے اپنے بزرگوں کو خراج عقیدت پیش کرنے خیرات کرے وغیرہ وغیرہ ۔

مہابھارت میں اس بات کا تفصیلی ذکر ہے ۔ پانڈووں نے پورے بھارت دیش کی یاترا کی تھی ۔ اسی لئے آج ہمالیہ سے لیکر مدراس تک جس تیرتھ استھان پر جائیں وہاں مقامی لوگ یہہ بتلاتے ہیں کہ پانڈو اس مقام پر آئے تھے ۔

مہابھارت کی جنگ میں فتح کے بعد مہاراجہ یدھشٹر ایک بار پھر تیرتھ یاترا پر گئے تھے تاکہ جنگ میں مرنے والوں کی یاد میں خیرات تقسیم کرکے انھیں خراج

عقیدت پیش کیا جائے تا کہ انھیں روحانی تسکین حاصل ہو۔

پانڈووں کے والد کے وزیر اعظم ودورجی جو ایک صوفی منش ہونے کے ناطے مہاتما کہلائے انھوں نے پورے دیش کی پری کر ما کی اسطرح انھوں نے اس پرمپرا کو قائم رکھا تھا جس کے لحاظ سے بغیر کسی دنیوی خواہش کے یہہ ہر ہندوستانی کا فرض ہے کہ وہ اپنے ملک کے مقدس مقامات کا سفر کرے۔

آج سے صرف سو سال قبل اسی پرمپرا کا احترام کرتے ہوئے سوامی وویکانند نے کشمیر سے کنیا کماری تک اور کلکتہ سے گجرات تک پیدل یاترا کی اور جب کنیا کماری کے پاس سمندر کے بیچوں بیچ چٹان پر بیٹھ کر تین دن اور رات مسلسل بغیر کھائے پیئے تپسیا کی تو صرف ایک ہی منت یا دعا مانگی کہ ہندوستان پھر سے ایک عظیم قوم بن کر جاگے اور دنیا کی روحانی قیادت کرے۔

سارے ہندوستان کے تیرتھ استھان یا تو کسی مقدس ندی یا سمندر کے کنارے یا پھر دلکش پہاڑیوں پر بسائے گئے ہیں۔ جہاں پہنچکر دل و دماغ کو چین اور آتما کو شانتی ملتی ہے۔

اسی ہندوستانی پرمپرا پر چلتے ہوئے بنسی راجہ نے تقریباً ۴۵ سال کے دوران ۱۸۵۱ء سے ۱۸۹۶ء کے درمیان شمال میں ہمالیہ کے قریب جوالا مکھی و امرت سر سے جنوب میں سری رنگم تک اور مشرق میں کلکتہ سے مغرب میں ناسک تک کا سفر کیا اور سفر نامے قلمبند کر کے اس وقت کے ہندوستان کا تہذیبی نقشہ محفوظ کر دیا اس لئے ان کے سفر نامے دلچسپ اور معنی خیز ہیں۔

بنسی راجہ نے ۱۹ ویں صدی میں سفر کے لئے جو بھی سہولتیں مہیا تھیں ان سب سے مستفید ہوتے ہوئے ہندوستان کے طول و عرض کا سفر کیا۔یہاں تک کہ انھوں نے بیل گاڑی میں سوار ہو کر ناسک سے ترمبک جانے کے لئے ۲۴ گھنٹے بیل گاڑی سے ریگڑ بھرے اور تکلیف دہ راستے کی پرواہ نہیں کی اس کے برعکس جب پہلی بار ریل کا سفر کیا تو اس سفر کو بہت ہی فلسفیانہ انداز میں ہندی کویتا میں اسطرح

قلمبند کیا:۔

کال نگر کو پہنچاوت ہے چھن میں پون سمان
بالک پن اور ترن اوستھا دو ٹیشن درمیان
چیت اوکاش بہت ہی تھوڑا دھر لے پر بھو کو دھیان
رام نام کا ٹکٹ جتن کر سکھہ پاویں گے پران
گردھاری ہی انجن والا
نرنجن ہیں بھگوان

مطلب :۔ کال نگر سے مراد دنیا۔ ایک جگہہ سے دوسری جگہہ تک ریل ہوا کی طرح تیزی سے پہنچ جاتی ہے۔ جس طرح بچپن سے جوانی تک پہنچنے کا وقت نہیں معلوم ہوتا۔ اسی طرح دو اسٹیشنوں کے درمیان کی دوری یاد نہیں رہتی دوران سفر ٹکٹ کو سنبھال کر رکھنا ہوتا ہے۔ اسی طرح دوران زندگی اگر ہر شخص رام نام یعنے اللہ کی یاد کے ٹکٹ کو سنبھال کر رکھے تو زندگی کامیاب ہوجاتی ہے۔ اور منزل مقصود پر پہنچ جاتی ہے۔

انسان یعنے گردھاری (شاعر) ایک انجن کی طرح اور اس انجن کو طاقت دے کر چلانے والا بھگوان ہے۔ جو نرنجن ہے دکھائی نہیں دیتا۔

سفرنامے فارسی نثر میں لکھے ہیں۔ ہر مقدس مقام سے تعلق رکھنے والے بھجن صاف اور سلیس ہندی میں ہیں اور کہیں کہیں اردو میں منظوم کلام ہے۔

سفرنامے کو توشہء عاقبت کا نام دیا ہے وہ اسے طبع نہ کرواسکے۔

بنسی راجہ ۹ بار کاشی گئے کیونکہ انھیں بھاسکر آنند سوامی سے بڑی عقیدت تھی۔ آخری بار فبروری ۱۸۹۶ء میں اپنے فرزند نرسنگ راج (عاؔلی) کی شادی کے لئے

ڈاکٹر شیلا راج نے اردو میں بہ عنوان "توشہء عاقبت" ان سفرناموں کا ترجمہ سن ۱۹۸۴ء میں شائع کیا۔

گئے تھے جو حسب ہدایت سوامی جی کاشی میں انجام دی گئی دلہن بھوپال کی تھی ۔ دلہن کا نام تھاراج رانی ۔ شادی کے لئے وہ حیدرآباد سے جب گئے تو ساتھ میں دو سو براتی بھی تھے جن میں مدعو حضرات کے علاوہ مسلح سپاہی، نوبت، روشن چوکی اور بیانڈ سب ہی حیدرآباد کا تھا ۔ چونکہ سفر میں اسلحہ لے جانے پر پابندی تھی اس لئے ریذیڈنٹ حیدرآباد کو سر آسماں جاہ مدارالمہام نے لکھا کہ بنسی راجہ ریاست حیدرآباد کے بہت ہی معزز اور قابل احترام بزرگ ہیں اس لئے انھیں اجازت دی جائے ۔

بنسی راجہ جس مقام پر گئے اس مقام کی خوبیاں بیان کیں یہاں تک کہ انھوں نے پونا ۔ پنڈھرپور اور کانچی پورم کو جنت اور فردوس بتلایا ۔ اس سے یہہ ظاہر ہوتا ہے کہ انھیں اپنے دیش کے ہر خطے اور ہر مقام سے محبت تھی اور یہہ جذبہ صرف ایک محب وطن ہی میں پیدا ہو سکتا ہے ۔ یہہ حب الوطنی کا جذبہ روحانی اقدار کی عکاسی کرتا ہے ۔ اس میں سیاست کا دخل کم ہے ۔ چنانچہ وہ کہتے ہیں :-

رشک فردوس ہے عالم میں فضاء پونے کی
پھر پسند آئے نہ کیوں آب و ہوا پونے کی !

•

ہنودان را عبادت گاہ دین است — چہ پنڈھرپور بیکنٹھ برین است
ہمین است و ہمین است ہمین است — اگر فردوس برروئے زمین است

وہ مقامی لوگوں سے گھل مل جاتے تھے ۔ انھیں اپنی نظم یا بھجن لکھکر دیتے اور ان سے خواہش کرتے کہ وہ اس بھجن کو گاکر سنائیں ۔ دوران سفر وہ سنت، مہاتماؤں اور بزرگان دین سے تنہائی میں گفتگو کرکے تسکین حاصل کرتے تھے ۔
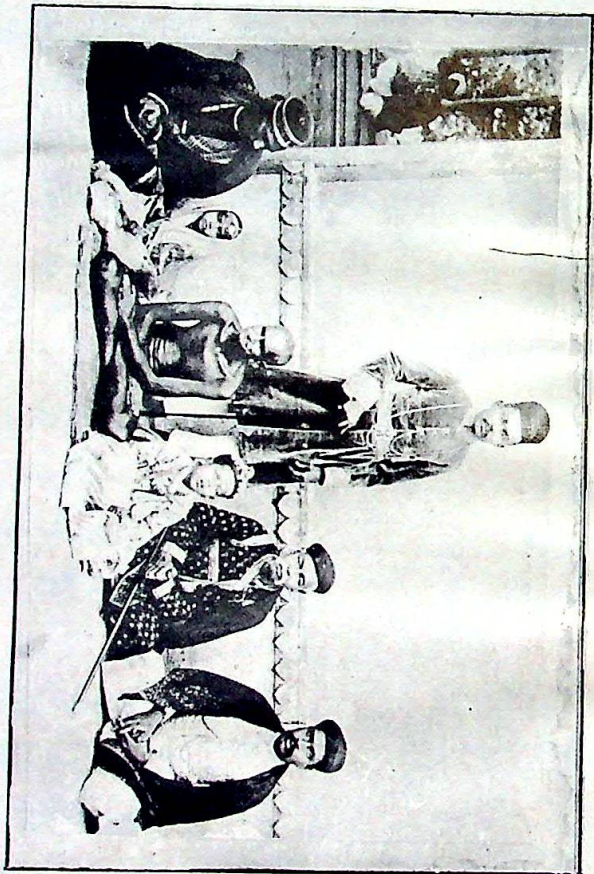
ہنسی راجہ کاشی میں سوامی بھاسکر آنند مہاراج کے ساتھ
تصویر راجہ نرسنگ کی شادی کے موقع پر لی گئی فبروری ۱۸۹۶ء

سفرناموں کا گوشوارہ

	سال	مقامات
پہلا سفر	۱۸۵۰ء	عالم پور سری سلیم مہانندی
دوسرا سفر	۱۸۶۰ء	مانک نگر ۔ تلجاپور ۔ پنڈھرپور
تیسرا سفر	۱۸۵۶ء	پھٹک سیلا ۔ انا گوندی
چوتھا سفر	۱۸۷۴ء	مدراس ۔ تروپتی ۔ سری رنگم ۔ کانچی پورم
پانچواں سفر	۱۸۷۵ء	اورنگ آباد ایلورہ ناسک
چھٹا سفر	۱۸۷۶ء	الہ آباد ۔ کاشی ۔ گیا ۔ ایودھیا
ساتواں سفر	۱۸۷۶ء	پونا الندی
آٹھواں سفر	۱۸۷۷ء	دہلی ۔ متھرا ۔ بندراپن
نواں سفر	۱۸۸۰ء	الہ آباد ۔ کاشی، بندپاسنی (مرزاپور)
دسواں سفر	۱۸۸۱ء	گلبرگہ ۔ اورنگ آباد ۔ پونا
گیارواں سفر	۸۳-۸۴ء	بنارس ۔ کلکتہ ۔ جوالامکھی امرت سر ۔ اجمیر
بارھواں سفر	۱۸۸۷ء	الہ آباد ۔ بنارس، گیا
آخری سفر	۱۸۹۶ء	جو انھوں نے اپنے فرزند راجہ نرسنگ راج کی شادی کے لئے کیا تھا ۔ حسب ہدایت بھاسکر آنند سرسوتی یہہ شادی کاشی میں فبروری ۱۸۹۶ء میں انجام پائی تھی شادی کے بعد جو تصویر کھنیچی گئی تھی صفحہ پر ملاحظہ فرمائیے ۔ اس سفرنامے کو وہ قلمبند نہ کرسکے ۔

سفرناموں کا اقتباس

پہلا سفر ۱۸۵۰ء

مقامات = تانڈور، الپور (موجودہ عالم پور) سری سلیم، مہانندی

اس سفر پر بنسی راجہ نواب رونق علی خاں شاہ یارالدولہ کی دعوت پر ان کی جاگیرات الپور وغیرہ نواب صاحب کے ساتھ تشریف لے گئے۔

ان کے ساتھ سفر میں ان کے والد رائے نرہری پرشاد بھی تھے۔ اس کی وجہ یہہ تھی کہ الپور سے سری سلیم جو ہندوؤں کے لئے ایک مقدس مقام ہے وہ جاترا کے لئے جائیں۔ سری سلیم دریائے کرشنا کے کنارے واقع ہے جہاں بھگوان شیو کا مشہور مندر ملکارجن واقع ہے۔

گردھاری پرشاد اور ان کے والد دونوں نواب صاحب کی اجازت سے مہاشیوراتری منانے کے لئے سری سلیم گئے۔ دلچسپ واقعہ جو بنسی راجہ نے قلمبند کیا ہے وہ یہہ ہے کہ یہاں چراغ جلانے روئی کی بتیاں دستیاب نہیں تھیں۔ ملازمین دیول کے پرانے کپڑوں سے چراغ جلانے کی بتیاں بنائی گئیں اور اس کے معاوضے میں نئے کپڑے دیئے گئے۔ وہ اپنے مرتبے کا خیال کئے بناء کرشاندی سے پانی کا گھڑا اٹھا کر لائے اور سادھوؤں کے ساتھ بیٹھ کر پوجا انجام دی۔

دوسرا سفر:۔ **مقامات = مانک نگر۔ خانہ پور، تلجاپور، پنڈھرپور**

اس سفر میں ۵۰ لوگ ساتھ تھے ان میں والد رائے نرہری پرشاد بھی شامل تھے۔

مانک پربھو مہاراج اپنے زمانے کے مشہور سنت اور صوفی تھے ان کے پاس ہندو، مسلم یا برہمن اور شودر میں کوئی امتیاز نہیں برتا جاتا تھا۔

بنسی راجہ نے مہاراج سے تنہائی میں گفتگو کی۔ مہاراج نے انھیں پرشاد میں کھڑاؤں دیئے۔ انھوں نے اس سے مانک پربھو کی گدی احاطہ، دیوی دیول واقع کیشو گیری میں قائم کی اور وہاں یہہ کھڑاؤں آج بھی محفوظ ہیں۔

تلجاپور میں ایک دلچسپ بات یہہ ہے کہ یہاں برہمنوں کو پوجا کرنے کی اجازت

نہیں ہے صرف مراہٹہ لوگ پوجا کرتے ہیں ۔

پنڈھرپور کے بھگوان ہیں پنڈھری ناتھ ۔ مندر میں ہونے والی پوجا صبح پانچ بجے آرتی سے شروع ہوتی ہے پنڈھرپور کو جنت کے مماثل قرار دیتے ہوئے انھوں نے فارسی میں ایک نظم بھی قلم بند کی ۔ اس کے علاوہ ہندی میں بھجن لکھ کر کتھا کرنے والے پنڈت کو دیا پنڈت نے ۵ ہزار یاتریوں کے سامنے یہہ بھجن سنایا ۔

تیسرا سفر :۔ مقامات = پمٹھک سیلا ۔ اناگوندی

یہہ مقامات دریائے تنگبھدرا کے کنارے واقع ہیں ۔ یہہ دونوں مقامات رامائین کے زمانے سے مشہور ہیں کیونکہ بھگوان رام کی یہاں ہنومان جی اور سگریو سے ملاقات ہوئی تھی ۔

ان دونوں مقامات اور ان کے اطراف و اکناف میں بہت سارے مندر ہیں جو فن تعمیر اور بت تراشی کا بہترین نمونہ ہیں ۔

چوتھا سفر :۔ مقامات = تروپتی تروملا ۔ مدراس ۔ سری رنگم ۔ کانچی پورم ۔

۲۰ اراکین خاندان ہم سفر تھے ۔

بھگوان بالاجی کے دیول کے نظم و نسق آمدنی و خرچ اور وہاں منعقد ہونی والی سیوا ۔ اور پوجاؤں اور تقاریب کی تفصیل دی گئی ہے ۔

تروملا پہاڑ پر واقع دوسرے تیرتھ استھانوں کا بھی تذکرہ ہے ۔

مدراس میں پارتھا سارتھی کے دیول کے روبرو سمندر میں اشنان کیا اور پھر پارتھا سارتھی بھگوان کی پوجا کی ۔ مدراس سے سری رنگم گئے ۔ سری رنگم شہر تروچناپلی کے پاس ہے ۔ دراصل سری رنگم ایک جزیرہ ہے جو کاویری ندی کے درمیان ۲۰ میل مربع رقبے پر قائم ہے ۔ یہاں بھگوان رنگ ناتھ جی کا قدیم عالیشان اور مشہور مندر ہے

اس دیول میں ہونے والی پوجا اور سیواؤں کی تفصیلات فراہم کی گئی ہیں ۔

کانچی پورم :۔ کانچی پورم میں تین مشہور مندر ہیں ۔ بھگوان وشنو کا مندر وشنو کانچی کے علاقے میں بھگوان شیو جی کا شیو کانچی میں ہے ۔ دیوی کاماکشی کے دیول میں

سری ینتر کی استھاپنا آدی شنکر آچاری نے کی تھی۔

ان تینوں مقامات میں ہونے والی پوجا پاٹ کی تفصیلات فراہم کی گئی ہیں۔ اس سفر سے واپسی کے بعد بنسی راجہ کی دوسری شادی غیر متوقع حالات اور ان کی مرضی کے خلاف طے ہوئی اور انجام پائی۔ انھیں سالار جنگ اول اور مہاراجہ نریندر کے مجبور کرنے پر شادی کرنا پڑا۔

پانچواں سفر:۔ مقامات = اورنگ آباد۔ ایلورہ۔ ناسک

اورنگ آباد بھتیجے کی شادی کے لئے تشریف لے گئے تھے۔ وہاں سے ایلورہ مشہور غار دیکھے اور ایک نظم لکھی۔ خلد آباد جو اورنگ آباد سے قریب ہے۔ وہاں زرزری بخش برہان الدین اولیاء، اورنگ زیب، ناصر جنگ شہید اور آصف جاہ اول کے مزاروں پر چادر گل چڑھائی۔

اورنگ آباد سے واپس حیدر آباد کے لئے جب ریلوے اسٹیشن پہنچے تو ناسک کی یاترا پر جانے کا خیال ہوا۔ لیکن روپیہ بالکل ساتھ نہ تھا اتفاقاً وہاں حیدر آباد کے ایک ساہوکار سے ملاقات ہوئی اور رقم مبادلہ لیکر یاترا کے لئے ناسک پہنچے۔

ناسک اور ترمبک کی یاترا کی پوجا کا آنند اٹھایا اور ان مقامات کے تعلق سے ضروری معلومات قلمبند کیں۔

چھٹا سفر:۔ مقامات = جبل پور۔ الہ آباد، بنارس (کاشی)۔ گیا۔ ایودھیا۔ مرزا پور

سفر میں رشتہ دار پنڈت اور ملازمین ساتھ تھے۔ بنسی راجہ کے والد راے نرہری پرشاد نے یوگ وسشٹ کا ترجمہ ہندی میں نرہری پرکاش کے نام سے کیا تھا۔ اس کتاب کی رسم اجراء شہر حیدر آباد میں ہو چکی تھی۔ لیکن کاشی میں اس کتاب کو پنڈتوں میں تقسیم کرنے کے لئے نرہری پرشاد جی تشریف لے گئے۔ ان کے ساتھ بنسی راجہ بھی سفر پر نکل پڑے۔ ہر مقام کی مذہبی اہمیت اور وہاں جو مذہبی رسومات اور پوجا کی اس میں تفصیل دی گئی ہے۔

ساتواں سفر:۔ مقامات = پونا۔ الندی

میر محبوب علی خاں ۔ پرنس آف ویلز کا استقبال کرنے بمبئ جانے والے تھے ان کے سفر کی پہلی منزل تھی پونا۔

بنسی راجہ پونا پہنچکر حضور کی سواری کا انتظار کر رہے تھے ۔ کچھ دن بعد اطلاع دی گئ کہ ناسازی مزاج کی وجہہ سے حضور کا دورہ منسوخ ہو گیا ۔ اس دوران بنسی راجہ نے مقام الندی کی یاترا کی جو گیانیشور مہاراج کی جائے رہائش رہی تھی ۔ گیانیشور مہاراج نے بھگوت گیتا کا مراہٹی میں ترجمہ کیا تھا جو گیانیشوری کے نام سے مشہور ہے ۔

آٹھواں سفر:۔ جنوری ۱۸۷۷ء مقامات = دہلی ۔ متھرا ۔ بندرابن

ملکہ وکٹوریہ نے ہندوستان کی شہنشاہ ہونے کا اعلان کیا ۔ لارڈلٹن (Lord Lytton) گورنر جنرل ہندوستان نے جنوری ۱۸۷۷ء میں اس شہنشاہی کا اعلان کرنے کے لئے ایک دربار دہلی میں منعقد کیا ۔ اس میں شرکت کے لئے دیسی ریاستوں کے حکمرانوں کو مدعو کیا گیا۔

نظام سادس میر محبوب علی خاں کو مسٹر سانڈرس ریذیڈنٹ حیدرآباد نے مدعو کیا ۔ میر محبوب علی خاں کے شاہی قافلے میں سالار جنگ اول ، وقار الامراء ، مہاراجہ نریندر پیشکار سلطنت اور بہت سے امراء کیساتھ بنسی راجہ بھی شامل تھے ۔

۷/ جنوری کو دربار منعقد ہوا ۔ دربار کے لئے ایک وسیع میدان کے وسط میں ایک چبوترہ تعمیر کیا گیا تھا اور اس پر ایک عالی شان مصنوعی محل بنوایا گیا تھا۔

حکمرانوں کی نشست ایک علیٰحدہ خیمہ میں تھا جہاں قیمتی کرسیاں ان کے درجے اور مناصب کے لحاظ سے ترتیب دی گئیں تھیں ۔ اس خیمے کے مدمقابل دوسرے خیمے میں راجکمار و امراء رئیس جو اپنے اپنے حکمرانوں کیساتھ آئے تھے ان کی نشست کا انتظام تھا۔

وقت مقررہ پر گورنر جنرل اپنے ہاتھ میں فرمان لئے تشریف لائے ۔ ان کی شہ نشین کے بازو میر محبوب علی خاں کی کرسی تھی جو ڈنڈا پینگی کے نیچے تھی، ان کی تقریر ختم ہوتے ہی تمام حاضرین نے کھڑے ہو کر جوش وخروش کیساتھ تالیاں بجائیں اس کے بعد تقریباً ۲۰ ہزار مسلح فوجی سپاہی اور افسران نے سلامی دی ۔ سلامی کے لئے جب توپیں داغی گئیں تو سارا آسمان پھٹ گیا ۔ اس اعلان کے تعلق سے ایک نظم فارسی میں لکھی

نظم دلکش بخطاب شہنشاہی حضور ملکہ معظمہ
دام اقبالہا

کوئین بر شنیدم شہنشاہ شد — دلم زین حقیقت نہ آگاہ شد
شہنشاہ یورپ شدن مشکل است — وگر بہر ہند است بے حاصل است
کہ در خطہ ہند یک شاہ نیست — پس این اشتہار شہنشہ ز چیست
بشد باغ دہلی زبوں تر ز راغ — نمودند مدراس را بے چراغ
اودہ شد پراگندہ چون نام خویش — رسیدہ شہِ او بہ انجام خویش
بگجرات و لاہور و ملتان چیست — بیاں کن کہ راجا و سلطان کیست
چہ غمناک شد راجہء ناگ پور — بشد دور از ملک میسور سور
چنان بانگ فریاد زد ہولکر — کہ گوش فلک گشتہ از ہول کر
ز مرہٹ چہ گویم کہ گمنام شد — زرانا چہ پرسی کہ ناکام شد
فروغ حکومت بہ اندور نیست — کسی را فراغت باین دور نیست
بڑودہ شدند اتہام — بسی غصب گشتہ است ملک نظام
کسانیکہ باقی حکومت ورانند — بحق قدامت وظیفہ خورانند
شہنشاہ را تاج بخشی سزاست — زشاہان اگر باج گیرد رواست
بانصاف گر حق رسانی کنند — بہ اولاد شاہان ریاست دہند
بہر ملک شاہی مقرر شود — جہاں را سر انجام دیگر شود

درآن وقت این نام بانامی است
وگرنہ فقط لفظ بمعنی است

باقی نے اپنی اس تخلیق سے اس وقت سارے ہندوستان میں انگریزوں کی سیاسی و سامراجی حکمت عملی کے خلاف جو غم و غصہ کی لہر تھی اس کی ترجمانی کی تھی اس میں ان کے حب الوطنی کے جذبے کا اظہار بھی ہے۔ اس نظم کے تاریخی اور سیاسی پس منظر کا تجزیہ کیا جائے تو واضح ہوگا کہ یہ ایک ذہین فنکار اور ایک ذمہ دار ہندوستانی کے دل کی آواز ہے جس نے برطانوی سرکار کی غیر اخلاقی، غیر قانونی اور جبر و زیادتی پر مبنی کارناموں کا پردہ فاش کیا ہے اور اس، جشن شہنشاہی میں شرکت کے لئے آئے ہوئے سب ہی ہندوستانیوں سے مخاطب ہونے کے لئے اس موقع کو ہاتھ سے جانے نہ دیا اور اس نظم کی پرچیاں کھلے عام تقسیم کیں۔

باقی فرماتے ہیں:-

ملکہ وکٹوریہ تو یوروپ کی شہنشاہ نہیں بن سکتیں۔ اسی طرح ان کا ہندوستان کی شہنشاہ بننا بھی بے سود ہے۔ اس لئے کہ اب ہندوستان میں کوئی راجہ ہے نہ کوئی حکمران۔ ایک شہنشاہ کی شان تو اس میں ہے کہ وہ اپنے ماتحت حکمرانوں کیساتھ عدل و انصاف کرے۔ اس کے برخلاف جو شہنشاہی کا اعلان کر رہے ہیں انھوں نے اپنے اعمال سے حکمرانوں اور رجواڑوں کو ان ملازمین کی صف میں کھڑا کر دیا ہے جو وظیفہ خوار کہلاتے ہیں۔

- بہادر شاہ ظفر کو معزول کر کے دہلی کے باغ کو صحرا سے بھی زیادہ ویران کیا۔
- ریاست اودھ کے ٹکڑے ٹکڑے کر کے واجد علی شاہ برخواست کر دیئے گئے۔
- گجرات ملتان اور لاہور کے بارے میں انھوں نے صرف ایک شعر میں پورا حال بیان کر دیا ہے۔ اس کا پس منظر کچھ اس طرح ہے۔

راجہ رنجیت سنگھ کا پایہ تخت لاہور تھا اور ان کی ریاست پنجاب اور گجرات کے ایک وسیع علاقہ پر پھیلی ہوئی تھی۔ رنجیت سنگھ کے انتقال کے وقت ان کے شہزادے دلیپ سنگھ کم سن تھے اس لئے ان کی ماں رانی جھندان Regent مقرر کی گئیں، لیکن اس کے تھوڑے دنوں بعد رانی سے ایک معاہدہ پر زبردستی دستخط کروا کر انگریزوں نے

انھیں برخواست کر دیا ۔ انگریزوں کی اس حرکت کو سکھ اور پنجابی عوام برداشت نہ کر سکے ۔ اس کے خلاف ملتان کے گورنر مل راج نے اور گجرات کے گورنر نے بغاوت کی اس بغاوت کو کچل کر انگریزوں نے ان دونوں صوبوں کو ہڑپ کر لیا۔

اس سے قبل 1799ء میں ٹیپو سلطان کو شکست دے کر میسور کا صفایا کیا تھا۔ ۱۸۱۷ء میں آخری پیشوا باجی راؤ سے ایک معاہدے پر زبردستی دستخط کروائے ۔ کچھ مدت بعد جب باجی راؤ نے اس کی مخالفت کی تو پیشوا حکومت کو ختم کر دیا گیا اور باجی راؤ کی سالانہ پنشن مقرر کر دی ، اس غیرقانونی اور نازیبا سلوک کے خلاف ناگپور کے حاکم اپا صاحب اور اندور کے ملہار راؤ دوم نے جنگی کاروائی کی ۔ اس وقت گوالیار کے صوبے دار راجہ سندھیا اور بڑودے کے راجہ گائیکواڑ خاموش تماشائی بنے رہے ۔ یوں اپا صاحب کو بہ آسانی شکست دیکر برخواست کر دیا گیا ۔ ان ناانصافیوں کا سلسلہ جاری رہا ۔ سرکار نظام نے انگریزوں سے اشتراک عمل رکھا تھا اس کے باوجود علاقہ برار کو ایک معاہدے کے تحت ہڑپ کر لیا اور اسی طرح بڑودہ کے ایک زرخیز علاقے مہسانہ کو بھی ۔ یہ نظم تاریخی واقعات کی بہترین عکاسی کرتی ہے ۔ نظم کو باقی اس وارننگ پر ختم کرتے ہیں کہ :

" ناانصافی اور زبردستی کا انجام برا ہوتا ہے " ۔ جو ایک مدت کے بعد صحیح ثابت ہوئی

تعجب اس بات کا ہے کہ انگریز سرکار کی خفیہ نے اس نظم کے خلاف کوئی کاروائی کیوں نہیں کی ۔

ایسے وقت جب انگریز حکومت اپنی طاقت اور شان و شوکت کا جشن منا رہی تھی باقی نے یہ نظم لکھ کر اپنے سیاسی شعور ، بیدار مغزی اور جرآت مندانہ جذبہ حب الوطنی کا شاندار مظاہرہ کیا ۔

چھپوا کر کئی سو حاضرین میں تقسیم کی ۔ یہہ نظم پسند کی گئی ۔ نظم اور اس کی تشریح صفحہ نمبر ٦٤-٦٦ ملاحظہ ہو ۔

اس کے بعد دو دن کی رخصت لے کر متھرا اور بندرابن کی یاترا پر گئے ۔ دہلی میں تقریباً ۲۵۰۰ اراکین کایستھ برادری رہتے تھے ۔ اسی محلہ میں انھیں ایک پرتکلف دعوت بھی دی گئی ۔

نواں سفر:۔ الہ آباد میں کمبھ میلا میں شرکت ، کاشی بنارس ، مرزا پور

سالار جنگ اور نواب وقار الامراء کے درمیان اختلافات اور بدگمانیوں کا سلسلہ چل رہا تھا ۔ جس کی ثالثی بنسی راجہ نے بہ خوبی انجام دی لیکن وقار الامرا کے اچانک انتقال کی وجہ سے ان کے لڑکے خورشید جاہ اپنے والد کی جگہ Co-Regent بننا چاہتے تھے ۔ لیکن سالار جنگ نے اس تحریک کو مسترد کر دیا جس سے تلخیوں میں اضافہ ہوا ۔ اس ماحول سے دور چند دنوں کے لئے بنسی راجہ نے تیرتھ یاترا پر جانے کا ارادہ کیا اور سالار جنگ سے رخصت حاصل کی ، الہ آباد کے لئے بذریعہ ریل روانہ ہوئے ۔ ان دنوں پریاگ راج میں کمبھ کا میلا تھا ۔

جب وہ جبل پور اسٹیشن پہنچے تو وہاں پلیٹ فارم پر لارڈ ڈیلی ریذیڈنٹ حیدرآباد سے ملاقات ہوئی جو کلکتہ سے حیدرآباد واپس ہو رہے تھے ۔ دوران گفتگو ان سے التجا کی کہ ان کے اسٹاف کے ہندوؤں میں سے اگر کوئی کمبھ کے میلے میں شرکت کرنا چاہتا ہو تو اسے اجازت دیں ۔ ریذیڈنٹ کے خانساماں مدلیار صاحب بنسی راجہ کیساتھ کمبھ میلے کے لئے الہ آباد جانے ساتھ ہو گئے ۔

کمبھ کے میلے کی دلچسپ تفصیلات راجہ ممدوح نے فراہم کی ہیں جیسے کشتی کا کرایہ گھاٹ سے سنگم جانے ۲۰ روپے تھا انگریز سرکار ایک دوکان لگانے کے لئے ۔ Rs 200/- ٹیکس وصول کرتی تھی اور ایک اکھاڑے کی روزآنہ آمدنی ۳۰ ہزار روپیہ ہوتی تھی اور اسی اکھاڑہ میں ۳۰ من مٹھائی روز بنائی جاتی تھی ۔ اس زمانے میں بھی لاکھوں کی تعداد میں یاتری کمبھ میلے میں شریک ہو کر آنند اٹھانے کے لیے ہندوستان کے ہر ایک گوشے سے آتے تھے ۔

دسواں سفر:۔ مقامات = رائچور ۔ گلبرگہ ۔ اورنگ آباد ۔ پونا

نواب سالار جنگ چاہتے تھے کہ میر محبوب علی خاں کو امور سلطنت اور رعایا سے قریب تر لایا جائے ۔ اس لیے رائچور، گلبرگہ، اورنگ آباد کے سفر پر حضور کو لے کر روانہ ہوئے ۔ اس سفر میں بنسی راجہ بھی شریک تھے ۔ ان سب ہی مقامات کو بہت اچھی طرح سے سجایا گیا تھا جابجا خیر مقدم کے لئے کمانیں بنوائی گئیں اور بہت اعلیٰ پیمانے پر روشنی کی گئی تھی ۔ گلبرگہ میں خواجہ بندہ نواز کی درگاہ پر روایت کے مطابق دو پلہ مزعفر کی نیاز دلوائی گئی ۔

حضور کی سواری جب شولاپور اسٹیشن پہنچی تو اتفاقاً وہاں ہندوؤں کے مرشد ملپا مہاراج بھی مقیم تھے ۔ مہاراج ممدوح کو میر محبوب علی خاں کی جانب سے ایک شال اور ایک پگڑی نذر کی گئی اور ساتھ ہی ان کے ایک وقت کے کھانے کے لئے تمام اشیاء خوردنی (جسے ہندی زبان میں سی دا دینا کہتے ہیں) بھی بہم پہنچائے ۔

اورنگ آباد میں حضور نے حویلی نوکھنڈہ میں قیام کیا ۔ یہ حویلی آصف جاہ اول کی قیام گاہ تھی ۔ یہاں ایک دربار منعقد ہوا اور سب ہی جاگیرداران و افسران و زینداروں نے سرکار کو نذر دی ۔

یہاں سے سرکاری قافلہ پونا کی تفریح کے لئے جب پونا پہنچا تو انگریزی افسران حضور کا استقبال کرنے موجود تھے ۔

پونا ایک خوشگوار اور پر فضاء مقام ہے ۔ یہاں ہمہ اقسام کے پھل اور سبزیاں ملتی ہیں جو یہاں سے بمبئی بندرگاہ بھیجی جاتی ہیں ۔ سفر پونا پر ایک نظم بھی لکھی ۔

گیارہواں سفر:۔ مقامات = بنارس ۔ کلکتہ ۔ جوالا مکھی ۔ امرت سر ۔ (اجمیر) لشکر

ڈسمبر ۱۸۸۳ء اور جنوری ۱۸۸۴ء میں کلکتہ میں ایک صنعتی نمائش ہونے والی تھی میر محبوب علی خان عنقریب حکومت کی باگ ڈور سنبھالنے والے تھے ۔ اس لیے یہ طے پایا کہ حضور کلکتہ سفر پر تشریف لے جائیں اور وہاں ہونے والی نمائش دیکھ سکیں اور ساتھ ہی گورنر جنرل سے اس مبارک تاریخ کا قطعی طور پر تصفیہ کر سکیں ۔

شاہی قافلے میں بنسی راجہ خورشید جاہ اور مہاراجہ نرہندر پیشکار کے علاوہ بہت سے امراء بھی شامل تھے ۔ سفر کی پہلی منزل بنارس تھی ۔ بنارس ریلوے اسٹیشن پر

حضور کے استقبال کے لئے انگریز افسران موجود تھے ۔ مہاراجہ بنارس کے دیوان آئے لیکن مہاراجہ اور ان کے ولی عہد نہیں آئے ۔ حضور مہاراجہ بنارس کے مہمان تھے ۔ شاہی قافلے کی مہمان نوازی کے لئے مہاراجہ بنارس کی جانب سے لوازمات بھیجے گئے ۔ خورشید جاہ نے لوازمات واپس کر دینے کے لئے کہا ۔ بنسی راجہ نے جراءت کر کے کہا کہ ایسا کرنا شائستگی کے اصولوں کے منافی ہے ۔ کیونکہ جب تک مہاراجہ کے نہ آنے کی وجہہ نہ معلوم ہو جائے ایسا کرنا نامناسب ہے ۔ سب لوگوں نے اس سے اتفاق کیا ۔ دوسرے دن مہاراجہ اسیری پرشاد معہ کنورجی (ولی عہد) حضور سے ملنے کے لئے آئے سب سے پہلے انھوں نے حضور سے معافی مانگی کہ وہ ضعیفی اور بینائی کی کمزوری کی وجہہ سے نہ آسکے ۔ کنورجی ماموں کے آخری رسومات میں شرکت کے لئے گئے تھے اس لئے نہیں آئے اس قصور کے لئے حضور جو سزا دینا چاہیں دیں ۔ مہاراجہ کی صاف گوئی پر ہر شخص نے داد دی لیکن خورشید جاہ کے دل میں کدورت باقی رہی ۔ بنسی راجہ نے لکھا:

" اس کے اگلے دن حضور اور امرائے سلطنت مہاراجہ بنارس کے شاہی محل جو رام نگر کہلاتا ہے اور دریائے گنگا کے دوسرے جانب واقع تھا ۔ تشریف لے گئے ۔ حضور کے ہمراہ خورشید جاہ نہیں گئے ۔ میں بھی نہ جاسکا کیونکہ میرے سپرد حضور کی طرف سے کاشی کے پنڈتوں کو نقد رقم یعنے دکشنا اور مٹھائی تقسیم کرنے کی ذمہ داری تھی " ۔

بنارس سے سواری مبارک کلکتہ روانہ ہوئی ۔ حضور کے پرتپاک خیر مقدم کے لئے کلکتہ ریلوے اسٹیشن (ہوڑہ) پر فرش کیا گیا اور قالین بچھائے گئے مسٹر کارڈی ریذیڈنٹ حیدرآباد حضور کا استقبال کرنے موجود تھے شاہی قافلہ ایک عالیشان بنگلے میں مقیم رہا ۔

بنسی راجہ اپنے ساتھ پیلے رنگ کے اطلس کا آصفی پرچم لے گئے تھے ۔ اس پرچم کو بہت اونچے مقام پر لہرایا گیا ۔ ساتھ میں نوبت و روشن چوکی بھی تھی ۔ شائد کلکتہ کے شہری نوبت اور روشن چوکی پہلی بار سن کر خوش ہوئے ہوں ۔ لارڈ رپن گورنر جنرل حضور سے ملنے آئے ۔ جوابی ملاقات کے لئے جب حضور تشریف لے گئے تو ۲۱ توپوں کی سلامی دی گئی ۔

لارڈ رپن نے حضور کو خوشخبری سنائی کہ ۵ / فبروری ۱۸۸۴ء کو حضور حکومت حیدرآباد کی باگ ڈور سنبھالینگے۔

اس موقع پر بنسی راجہ نے حضور کو دو عدد پاندان اور عطردان پیش کئے۔ جو انھوں نے بدست نفیس گورنر جنرل کو تحفے میں دیئے۔

اگلے دن حضور نے وہاں منعقدہ نمائش کا معائنہ کیا۔ پھر کلکتہ کی عالیشان ہوٹل گئے گھوڑ دوڑ دیکھی اور کشتی رانی کا لطف اٹھایا۔

پہلی جنوری جو انگریزوں کے لئے ایک تہوار کا دن ہے۔ انگریز اور ان کی لیڈیز بہت ساری اشیاء کی خریدی میں مصروف تھے۔ ان کی عاشق مزاجی کا تماشہ دیکھا۔ شعراء کلکتہ نے جن میں خاص طور سے وحید الدولہ جو واجد علی شاہ کے دربار سے تعلق رکھتے تھے ایک مشاعرہ منعقد کیا۔ بنسی راجہ کو بھی مشاعرہ پڑھنے کے لئے مدعو کیا گیا انھوں نے دو غزلیں بھیج دیں کیونکہ مشاعرے سے ایک دن قبل جوالا مکھی کی یاترا پر چل پڑے تھے۔

جوالا مکھی، بنسی راجہ کے جداعظم شری سیتاب رائے آئے تھے اور یہاں سے ہمیشہ کے لئے وہ ہمالیہ ریاضت اور تپسیا کے لئے چلے گئے۔ یہاں سے انھوں نے خط بھیج کر اپنے فرزند دولت رائے کو اس بات کی اطلاع دے دی تھی۔

جوالا مکھی میں پوجا پاٹ کا آنند اٹھا کر امرت سر پہنچے۔ امرت سر کے امرت سروور کے بیچوں بیچ ہرمندر صاحب کا مشہور گردوارہ ہے

شبد کیرتن اور گرو گرنتھ صاحب کو ربابی اس دلکش انداز سے گاتے ہیں کہ سنتے ہی رہنے کو من چاہتا ہے کیونکہ ان کے جذبہ عقیدت کا دل پر بہت اثر ہوتا ہے۔

بنسی راجہ نے گرونانک کی شان میں ایک بھجن لکھکر ربابی کو دیا اس نے بہت دلکش انداز میں گایا۔ (یہہ بھجن صفحہ ۵۴ — پر ملاحظہ ہو)

گرونانک کے بعد ۹ اور گرو ہوئے۔ دسویں گرو تھے گرو گوبند سنگھ جی۔ ان کے بعد اب یہہ پرمپرا ہے کہ صرف گرو گرنتھ صاحب ہی گرو کی پدوی گرہن کرتی ہے گرونانک دیو کے جانشینوں کا شجرہ لیتے آئے۔ امرت سر سے حیدرآباد واپسی کے دوران اجمیر اسٹیشن پر چند گھنٹوں کے لئے تبدیلی ریل کے واسطے انتظار کرنا تھا۔ اس دوران

میں پشکر راج جاکر وہاں پوجا پاٹ کی۔یہاں برہماجی کا مندر ہے۔ سارے ہندوستان میں صرف اسی ایک جگہہ برہماجی کا مندر ہے۔ خواجہ معین الدین چشتی کی درگاہ نہ جانے کا سخت ملال رہا۔ کیونکہ حضور کے مسلسل ٹیلگرام مل رہے تھے کہ فوراً حیدرآباد پہنچ جاؤ وقت کی کمی کے باعث وہاں نہ جاسکے خواجہ صاحب کی درگاہ پر چادر گل اور شیرنی نذر کرنے کے لئے مجاور کے حوالے کی اور ایک معافی نامہ لکھکر خواجہ صاحب سے معافی مانگی۔

معافی نامہ

گنہ گارم معین الدین چشتی خطاوارم معین الدین چشتی
ترحم کن ترحم کن ترحم سزا وارم معین الدین چشتی
ہوس باقیست اندر دل طلب کن دگر بارم معین ا لدین چشتی

(گنہ گارہوں معین الدین چشتی۔ خطاوار ہوں معین الدین چشتی رحم فرمائیں، رحم فرمائیں، (رحم کا) سزاور ہوں معین الدین چشتی (آپ سے ملنے کی) دل میں ہوس باقی ہے، طلب کیجئے، دوبارہ معین الدین چشتی مجھے طلب کیجئے۔)

بارہواں سفر:۔ مقامات = جبل پور، پریاگ راج، کاشی اور گیا

میر محبوب علی خان کی خواہش پر ان کی بہن کی شادی میرلائق علی خان فرزند نواب سالار جنگ سے طے کرانی کی بہت کوشش کی لیکن ان کی والدہ اللہ رکھی بیگم جو بہت ہی متعصب خاتون تھیں انھوں نے حضور پر نور کی ہر بات اور بنسی راجہ کی ہر کوشش کو ٹھکرادیا۔ کیونکہ سالار جنگ کا تعلق شیعہ فرقے سے تھا۔ راجہ کو اس بات کا بہت دکھ تھا کہ اس کوشش میں ناکامی ہوئی۔ پھر راجہ نے سرکار سے رخصت مانگی اور اپنے پتا نرہری پرشاد سور گباشی کے پنڈدان کے لئے حسب روایت ناسک، جبل پور، الہ آباد، کاشی اور گیا کے مقدس مقامات کی یاترا کی۔

باقی بہ حیثیت شاعر

باقی اردو، فارسی اور ہندی تینوں زبانوں میں شعر کہتے تھے یوں تو ترکی، عربی اور سنسکرت کے بھی عالم تھے۔

اردو زبان کی حد تک فیض کے شاگردوں میں خاص مقام رکھتے تھے اس کا اعتراف انھوں نے اپنی غزلیات میں کیا ہے۔

حضرت فیض کا سب فیض ہے باقی پہلے
نہ سخن گوئی تھی ایسی نہ زباں دانی تھی

شائد یہہ کہنا درست ہوگا کہ وہ فیض کے سوا اردو سخن گوئی کی حد تک کسی اور کے شاگرد نہیں تھے۔

حضرت محمد علی عاشق ان کے فارسی کے استاد تھے۔

عاشق استاد کامل باقی شد * زان مایہ عشق حاصل باقی شد

گردھاری پرشاد کا ہندی زبان میں تخلص یعنے اپ نام گردھاری" تھا۔ اس بات کا انھوں نے کہیں بھی صاف الفاظ میں ذکر نہیں کیا کہ وہ ہندی میں کس سے لپنے کلام کی اصلاح کرواتے تھے۔ لیکن ان کے سفرناموں میں انھوں نے یہہ اعتراف کیا ہے کہ بھجن لکھ کر انھیں لپنے والد محترم نرہری پرشاد کے پاس روانہ کیا۔ نرہری پرشاد ہندی اور سنسکرت کے عالم تو تھے ہی اور ساتھ ہی ہندی میں تین تصانیف چھوڑ گئے ہیں۔ اس سے یہہ نتیجہ اخذ کیا جاسکتا ہے کہ نرہری پرشاد ہی لپنے فرزند " گردھاری " کے گرو تھے۔

دوارکا پرشاد افق جنھوں نے فارسی میں حیات باقی لکھی اور ۱۸۹۰ء میں طبع کروائی اور اس کے بعد باقی کا اردو دیوان " بقائے باقی " کے نام سے ۱۸۹۰ء میں لکھنؤ سے طبع کروایا تھا۔ ۱۸۸۹ء میں افق صاحب حیدرآباد تشریف لائے تھے اور باقی کے مہمان

تھے ۔ اتفاق سے باقیؔ کا اردو کلام دیکھا اور انھوں نے نہایت اصرار کیساتھ اس کو شائع کرنے کی اجازت لی ۔ اس کا ذکر دیباچہ بقائے باقیؔ میں کیا ہے اور ساتھ ہی باقیؔ کا جو مقام بہ حیثیت شاعر رہا اسے انھوں نے یوں بیان کیا ہے:

خوش سیر، خوش وضع ، خوش تقریر، خوش خو ، خوش نصیب
خوش کلام و خوش مقال و خوش خصال و خوش بیان

شاعر آتش زباں مانند برقؔ لکھنوی
منشی معجز رقم مثل دبیر آسماں

محسن انشا گری جوہر شناس شاعری
اہل فن کے سرپرست اہل سخن کے قدرداں

ناظم نظم نظامیؔ خسروؔ ملک نظام
سعدیؔ ملک دکن فردوسیؔ ہندوستاں

سنسکرت و فارسی و عربی و بھاشا• میں برقؔ
صورت رندؔ و وزیرؔ اردو میں یکتائے جہاں

اساتذہ و علامہ ہائے وقت باقیؔ کے کلام کو بہت پسند کرتے تھے چنانچہ رائے بچولال تمکینؔ ۔ مولانا حضرت عباس رفعت بھوپالی ۔ آغا سید علی شوستری طوبیٰؔ سنادالملک نے باقی کے کلام پر مضامین لکھے تھے ۔

ان سب احباب سے اور دیگر دوست احباب سے بھی جن میں قابل ذکر ملک الشعراء دوار کا پرشاد افقؔ ۔ راجہ درگاپرشاد مہرؔ راجہ صاحب سندیلہ (اترپردیش) مولوی صدیق حسین خاں نواب بھوپال سے خط و کتابت منظوم فرماتے تھے ۔

• (بھاشا سے مطلب ہندی زبان)

باقیؔ کا دور شاعری وہ ہے جبکہ دہلی میں ذوقؔ، غالبؔ اور مومنؔ اور لکھنؤ میں ناسخؔ اور آتشؔ اپنا سکہ جمارہے تھے۔ ایک طرف دبستان لکھنؤ ترقی پر تھا اور دوسری جانب دبستان دہلی کا شیرازہ بکھر چکا تھا۔ لکھنو کے عروج کے باوجود باقیؔ نے لکھنؤ اسکول کو پوری طرح قبول نہیں کیا۔ یہ بات اور ہے کہ کہیں کہیں ان کی غزلوں میں اساتذہ لکھنؤ کی جھلک نظر آتی ہے۔ اور انھوں نے اس کا اظہار اپنے ایک دو اشعار میں کیا بھی ہے۔

ایک غزل انداز پر ناسخؔ کے بھی باقیؔ لکھو
قافیے اچھے ہیں گو مرضی تمہاری اور ہے

حضرت فیضؔ کا تعلق اور سلسلہ دبستان دہلی سے رہا کیونکہ فیضؔ صاحب کے استاد تھے خواجہ میر دردؔ۔ اس لئے فیضؔ کی زبان، مزاج اور خیالات پر دہلی کا رنگ چھایا ہوا ہے۔

ایک عالم کی حیثیت سے باقیؔ نے لکھنؤ اور دہلی دونوں دبستانوں کے اساتذہ کے کلام کا مطالعہ کیا تھا۔ اور وہ خواجہ میر درد کے کلام سے متاثر تھے۔ اس کا انکشاف انھوں نے اپنے اس شعر میں صاف صاف کیا ہے۔

جناب میر کا پیرو ہوں باقیؔ * میرے شعر و سخن میں کیا اثر ہے

اس لحاظ سے ان کا کلام ان دونوں دبستانوں کے امتزاج کی نمایندگی کرتا ہے۔ اور یہی بات افق صاحب نے دیباچہ بقائے باقیؔ میں اسطرح سے بیان کی ہے:

میں نے دیکھیں چند غزلیں دیدہ، انصاف سے
ان میں پائی لکھنؤ کی اور دہلی کی زباں

آتشؔ و ناسخؔ وغیرہ شاعران مستند
غالبؔ و رشکؔ و وزیرؔ و رندؔ سے اہل زباں

ہر غزل میں ہے کلام میرؔ و سوداؔ کی تڑپ
شعر جو ہے اس میں ہے غالبؔ کی طباعی عیاں

روزمرہ مومنؔ و ذوقؔ و صباؔ و بحرؔ کے
ناسخؔ و برقؔ و وزیرؔ و دردؔ و آتشؔ کی زبان

" بقائے باقی " ان کا دیوان ۹۲ غزلوں ایک مخمس اور ۱۲ سلاموں پر مشتمل ہے۔ شعر کی ظاہری شکل، الفاظ کے استعمال، مناسبات لفظی، محاورے اور روزمرہ بہت ہی خوبی سے ادا کئے ہیں اور طرز ادا میں شستگی۔ سلاست اور برجستگی باقی کے کلام کے اہم اجزاء ہیں۔ چھوٹی بحر کی غزل میں صاف اور سلیس شعر کہے ہیں:

موجزن کوزے میں دریا دیکھا — دل میں دنیا کا تماشہ دیکھا
آرزو شوق مدعا مطلب — دل میں بھرے ہیں اے باقیؔ
بس جی بس چپ رہو ہوا معلوم — میں نے جب درد دل کہا بولے

محاوروں کا استعمال برجستہ اور خوب ہے۔

الٹی گنگا بہا رہے ہو — مجھ کو جو بتو رلا رہے ہو
میری آنکھیں ہیں یا کہ ہے پنگھٹ — پتلیاں بھرتی رہتی ہیں آنسو

حسن ادا باقیؔ کے کلام کی خاص چیز ہے۔ ان کا استادی رنگ اس سے ثابت ہے کہ پیرایہ بیان لطیف اور دلچسپ ہے۔ دراصل شاعر کا کمال یہی ہے کہ مضامین کو اس طرح نظم کر دیا جائے کہ اس میں لطافت پیدا ہو جائے۔

اردو شاعری کی ایک خصوصیت یہہ ہے کہ حضرت زاہد پر جملے کسے جائیں اس روایت کو بھی باقی نے برقرار رکھا۔

مبارک شیخ صاحب کو عمامہ * اٹھائینگے نہ یہ بار گراں ہم

خواجہ میر دردؔ کی دو سو رعبائیوں کا انھوں نے اردو میں ترجمہ کیا تھا ان رباعیات کو پڑھنے سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ترجمہ نہیں بلکہ اصلی رباعی ہے۔ ان رباعیات کو فارسی رباعیات کیساتھ باقیؔ کے فرزند راجہ نرسنگ راج عالیؔ نے "دردِ باقیؔ و دُردِ ساقیؔ" کے نام سے مرتب کر کے سن ۱۹۲۲ء میں طبع کروایا۔ اس اشاعت میں راجہ نرسنگ راج نے باقیؔ کی مختصر سوانح عمری اور حالات زندگی بھی فراہم کئے ہیں۔ اور یہہ کتاب بھی ان کی سوانح عمری پر بہت حد تک مبنی ہے باقیؔ کی رباعیوں میں شراب وحدت کا دریا امنڈ رہا ہے طرز اور ادائے مطلب بہت ہی صاف ہے۔ یہہ رباعیات معرفت سے بھری ہوئی ہیں۔

باقیؔ نے سلام بھی کہے ہیں۔ ان میں خیالات کے اظہار طرز ادا کا حسن، زبان کی سلاست اور الفاظ کے بر محل استعمال نے ان کے سلاموں کا مرتبہ بلند کر دیا ہے۔

باقیؔ نے مرثیہ اور ہجو نہیں لکھے۔

ان کی ایک فارسی نعت غزل اس قدر مقبول ہوئی کہ غلام امام شہید اکثر مجالس کا افتتاح اس نعت سے کیا کرتے تھے۔

انھوں نے ملکہ وکٹوریہ کی شہنشائیت کے اعلان کے سلسلے میں جو دربار دہلی میں ہوا تھا اس وقت فارسی میں ایک نظم لکھی تھی۔ جس کا ذکر ہم نے ان کے سفر نامے دہلی ۱۸۷۷ء میں بھی کیا ہے اس میں ان کے جذبہ، حب الوطنی کی بھی جھلک نظر آتی ہے۔

باقیؔ کے کلام کی خصوصیت یہہ ہے کہ ایک طرف وہ اپنے پرودگار اور اس کی ساری کائینات سے بے پناہ عقیدت اور محبت رکھتے ہیں تو دوسری جانب اپنے ماحول سے بے بہرہ نہیں ہیں انھوں نے ہندوؤں اور مسلمانوں کی معاشرت یا یوں کہئیے کہ ہندوستان کی تہذیبی و دینی و دنیوی رجحانات کا مطالعہ کیا اور پھر اس سماج کے نمائندہ بن کر اپنے شعر و سخن میں اس کی نمائندگی کی۔

انتخاب کلام

بھاگوت سار کا ایک بند

جئے جئے سری کرشن مہاراجا جنم لئے جگ تارن کا جا
نرگن سگن روپ جب دھارے سب پرتھوی کا بھار اتارے
مات پتا کے بند چھوڑاے نند جسومت بھاگیہ بڑھاے
جنم بدھائی آنند دینی پران پوتنا کے گھہ لینی
کیس پکڑ پھر کنس کو تاڑے پاپ تاپ کو مول اوکھاڑے

سار بھاگوت کو لکھیو بھگتی سون چت لاے
سنپت سنجت پائیں گے ہری جن لیلا گاے

ملک الشعراء دوارکا پرشاد افق نے بھاگوت سار کو ۱۸۹۰ء میں تارسی رسم الخط میں لکھنو پریس سے طبع کروایا تھا جو بہت مقبول ہوئی۔

حمد

اے مہر یہہ سب ہے نور تیرا
ہر ذرہ میں ہے ظہور تیرا

آرام ہزار ہو جہاں میں
پر درد رہے ضرور تیرا

انسان خاطی ہے ، تو خطا پوش
کیا فضل ہے یا غفور تیرا

ان کی شہ رگ سے توقریں ہے
دیتے ہیں پتہ جو دور تیرا

اپنے سے جدا خدا کو سمجھا
باقی دیکھا شعور تیرا

رباعی

ہرگز نہ حقیقت سے ہوا دل آگاہ اس کے ہیں وہی پائے طلب بر سرراہ
تو اپنی نشاندہی کرے یا نہ کرے ہم ہیں یہہ تیرا نام ہے اللہ اللہ

سلام

مجرئی میری چشم ترکو دیکھ غم حسین کے اثر کو دیکھ
اے فلک کیا یہ کی جفا تونے ان کو دیکھ اور اس سفر کو دیکھ
آج تک ہے شفق فلک پہ نمود خون حسنینؑ کے اثر کو دیکھ
کھینچ کر تیغ شہ نے فرمایا دیکھ میرے دل و جگر کو دیکھ

میرا چھوٹا سلام سن باقیؔ
اس معانی مختصر کو دیکھ

○

لب دریا نہ دیا تشنہ لبوں کو پانی کیا کہوں ظلم کیئے اس کے سوا کیا کیا کچھ
حمد حق نعت نبی یاد علی کر کر کے سر کھلے مانگتی زینب تھی دعا کیا کیا کچھ
کٹ گے ہاتھ تو مشکیزے کو منھ سے تھاما کیئے عباس نے حق ان کے ادا کیا کیا کچھ

قرۃ العین نبی اور علی کو باقیؔ
دیکھ دکھلاتا ہے آنکھوں سے خدا کیا کیا کچھ

O

چراغ آصفی کی روشنی باقی رہے باقی
حسینؓ ابن علیؓ کی روشنی باقی رہے باقی

یہی بارہ امام پاک سے ہے التجا میری
بس اس بارہ گلی کی روشنی باقی رہے باقی

حسینی شدی میں روشن کبوتر خانہ ہے جن کا
حسینی شہ ولی کی روشنی باقی رہے باقی

یہی ہے پنجتن سے پنج گانہ میں دعا میری
نظام* پنچی کی **روشنی باقی رہے باقی

چراغ خاندان نقشبندی جس سے روشن ہے
یہہ محبوب علی کی روشنی باقی رہے باقی

بہت عاشور خانے حیدرآباد دکن میں ہیں
قیامت تک سب ہی کی روشنی باقی رہے باقی

---

* نظام پنچی سے مراد نواب افضل الدولہ
** اور روشنی سے مراد محبوب علی پاشاہ ہیں

رباعیات

اللہ کی تجلی ہے ظہور اسماء ہم نے اسے پایا بہ حضور اسما
خورشید سے جس طرح منور ہے قمر یوں خلق منور ہے بہ نور اسما

یارب تجھے پہچانا کہ تو ہے معبود وہاں میں نے کیا سجدہ جہاں ہے مسجود
پایا ہے تجھ ہی کو میں نے سب اعیاں میں ہے تو ہی وجود اور تو ہی موجود

تیار سفر کا ہوگیا ہے اسباب اور قافلے والے ہیں سب ہی پا بہ رکاب
اے باقی کھڑا ہو تو بھی بہر تعظیم اٹھے ہیں سب اہل بزم کر اس میں شتاب

رحمت سے تیری کوئی نہ مہجور رہا ہر غم زدہ جان و دل سے مسرور رہا
بس بخت سیاہ اس کا معدوم رہا جو سایہ کہ زیر سایۂ نور رہا

کس کا کونین ہے سمجھ لے مطلب کیا مرگ ہے کیا زیست برابر ہیں سب
رنگ بیرنگ جب نظر میں آجائے تب سمجھے گا نیرنگی عالم کا سبب

ہے تیری ہی بو پر گزر بادصبا تیرے ہی طرف گلوں کا موسم ہے گیا
مخلوق سے یارب ہے تو کتنا نزدیک جو اپنے سے گزرا تری جانب گزرا

رباعیات کا انتخاب "درد باقی دردساقی" سے کیا گیا ہے جسے راجہ نرسنگ راج عالیؔ نے طبع کرایا۔ یہ خواجہ میر درد کی فارسی رباعیات کا منظوم ترجمہ ہے۔ جسے ۱۹۲۲ء میں راجہ نرسنگ راج عالیؔ نے طبع کرایا۔

○

ادراک نے جب دعوت پیدائی کی فریاد کہ بیداد شناسائی کی
مجھ کو تھا کہاں دماغ صحبت پہلے اس علم نے سب انجمن آرائی کی

جس کوچہ میں تو ہے نہیں وہاں اپنا گزر ہر سو میں ہے تو وہاں نہ گیا کوئی بشر
سب خلق تیری ذات کا گو آئینہ ہے جو منہ ہے ترا دیکھ نہیں سکتی نظر

ہر نیک و بد سے خوش ہوے شاد ہوئے آزاد گل و خار سے شمشاد ہوئے
تھا باعث تفرقہ ہمارا یہہ دل باندھا اسے زلف سے تب آزاد ہوئے

روشن ہے کبھی سحر کبھی ظاہر شام اس کون و فساد کا برا ہے انجام
مانند شرر نہ کر غرور ہستی اک چشم زدن میں کام ہوتا ہے تمام

مطرب فانی ہے بزم و ساقی فانی تو جس سے ملا وہ ہے ملاقی فانی
اس دار فنا میں دلگی خوب نہیں اللہ ہے باقی اور باقی فانی

معلوم نہیں گھر سے کہاں جاتا ہوں بھولا ہوا راستہ ہوں گھبراتا ہوں
شعلے کی طرح کہیں پہونچا ہوگا یوں آپ سے باہر جو نکل آتا ہوں

○

اے باقیؔ اگر صفائی جاں رکھتا ہے آئینہ حسن بے نشاں رکھتا ہے
دریا میں تو جا پہونچے گا سیلاب کی مثل تو بھی تو خود اک طبع رواں رکھتا ہے

گو باغ جہاں میں شوخ رنگ آیا ہوں شیشہ کی طرح سے زیر سنگ آیا ہوں
کب تک یہہ گرفتگی بہ رنگ غنچہ آپ اپنی ہی وضع سے میں تنگ آیا ہوں

گو لب پر رہا ہمیشہ حرف خنداں دل کو نہ ہوا میل بہ طرف خنداں
تھی مثل وہ گل کی سینہ چاکی کی مشق جو عمر کہ ہم نے کی ہے صرف خنداں

تحصیل فضل ہے جنھیں مد نظر سینہ میں بھرا ہے ان کے علم اور ہنر
پھولینگے پھلینگے اور اڑائینگے بہار وہ تخم جو بوئے ہیں یہہ ہے اس کا ثمر

ہرگز نہ حقیقت سے ہوا دل آگاہ اس کے ہیں وہی پائے طلب بر سرراہ
تو اپنی نشاندہی کرے یا نہ کرے ہم ہیں یہہ ترا نام ہے اللہ اللہ

گر ترک کرے حرص ہمارا یہہ دل ہوشاہ کی طرح سے حکمرانی حاصل
باقیؔ کو ہزار سلطنت مفت ملے جمعیت دل اس کو اگر ہو کامل

○

وہ باقیؔ فانی جو بڑا کامل تھا   دو روز کے آگے رونق محفل تھا
اب خاک پہ اس کی جاکے عبرت سے دیکھ   ہے مشت غبار اب کبھی یہہ دل تھا

ہر چند کریں اہل جہاں کار اپنا   کھوتا نہیں اعتبار اے یار اپنا
سائے کی طرح گری ہوئی ہیں لیکن   ڈالا نہ کسی پہ ہم نے یہہ بار اپنا

ساتھ اہل دل کے تندی خو پیدا کر   گلشن میں سکوت کی نمو پیدا کر
کب تک تو جلائیگا ہوا سے عزت   ہوخاک نشیں تو آبرو پیدا کر

مجرم ہوں اعتراف کرتا ہوں صاف   کیا منہ ہے جو چاہوں میں کچھ اپنا انصاف
یارب تو کریم ہے گنہگار ہوں میں   تقصیر معاف ہوگی تقصیر معاف

ایک دن دیدار یار ہوجائے گا   راز اس کا خود آشکار ہوجائے گا
میں آئینہ ہوں نگار ہے حسن پرست   ناچار کبھی دوچار ہوجائے گا

باقیؔ دنیا میں رائیگاں جینا ہے   ہر چند ہے زندگی گراں جینا ہے
ہم اپنی مراد سے نہیں مرسکتے   اوروں کی مراد سے یہاں جینا ہے

○

جاہل ہیں معرفت کو پہچانتے ہیں　　ہیں طفل مگر پیر ہمیں مانتے ہیں
ہم سے زنہار دوسری بات نہ پوچھ　　ہم جانتے ہیں جو کچھ کہ ہم جانتے ہیں

ہرچند کہ ادنیٰ ہیں مگر اعلیٰ ہیں　　پتھر ہیں مگر کعبے میں پابرجا ہیں
ہم سے جز نام دوسری بات نہ پوچھ　　مانند نگیں جلوہ گر اسما ہیں

کب تک اس موت سے ہے ڈرنا باقیؔ　　منقبح مسہل کی فکر کرنا باقیؔ
چھوڑا نہ اجل نے جب کسی کو تو پھر　　اس جینے پہ اسقدر نہ مرنا باقیؔ

باقیؔ جس دل نے راز حق کا سمجھا　　ہر بحث کو بس وہ بحث مولیٰ سمجھا
عارف جو جانا اس کو عارف جانا　　ملا جو سمجھا اس کو ملا سمجھا

افعال میرے ہیں گرچہ بیہودہ فضول　　ٹیڑھی سمجھ میری اور طبع جہول
اے رحمت بے علت حق ساتھ اس کے　　درگاہ سے تیرے رکھتا ہوں امید قبول

رہتے ہیں کبھی خوشی سے آسودہ ہم　　ہوتے ہیں کبھی غم سے غم آلودہ ہم
گل گشت گلشن تجہل کرکے　　اس گردش رنگ سے ہیں فرسودہ ہم

ہم علم و ہنر کے گہ طلب گار ہوے　　گاہے بیہودہ دربدر خوار ہوے
دریاے خیال پر کیا ہم نے ہجوم　　ہستی پل باندھا تجھ سے ہم پار ہوے

○

ہم صاف دلوں کو لطف کیا ہائے و ہو کا	اور ہم کو کہاں دماغ گفتگو کا
جز جلوہ یار ہم سے کچھ بات نہ پوچھ	ہم آئینہ ہیں ہم میں ہے عکس اس رو کا

ایک عمر میں دور سے سنا تھا اس کو	آغوش خیال میں لیا تھا اس کو
اب روبرو ہوگیا جو آئینہ کی طرح	وہ دیکھ لیا، میں نے نہ دیکھا اس کو

خمار نے گر خمار اپنا توڑا	نخوت سے جو محتسب نے مینا توڑا
یہہ بندے ہیں سب اپنے نفس کے باقی	میں بندہ ہوں اس کا جس نے نفس اپنا توڑا

طفلی گزری ہوئی جوانی حاصل	آتا ہے بڑھاپا نہ ہو اس سے غافل
گوجا پہ ہے اپنی مثل تار تسبیح	دانے کی طرح ہے قطع راہ منزل

کب تک یہ غرور بادشاہی کا ہے	اور فخر جہانداری کہاں تک کیا ہے
بس آج تو ناز کرلے جتنا چاہے	کل یاد میں تو کسی کے کب رہتا ہے

اے شاہ گدا کی طرز پر خاک پہ بیٹھ	اس بادشاہی سے درگزر خاک پہ بیٹھ
تو خاک میں ملجانے کے پہلے پہلے	تخت شاہی سے بس اتر خاک پہ بیٹھ

○

نیرنگی تشبیہ کی ضرورت آئی تنزیہ کے عالم میں کدورت آئی
وہ دل جو صفا میں مثل آئینہ تھا اب اس کو گرفتاری کی صورت آئی

موجود جہاں میں ہوئے اظہار ہوئے نظروں سے چھپے سب کے تو اسرار ہوئے
اپنی نیرنگی سمجھے اب ہم باقیؔ سو رنگ سے جس وقت نمودار ہوئے

ڈرتے ہیں کہاں گناہ کے قہر سے ہم ہوتے ہیں تلخ کام اس زہر سے ہم
ہر چند زمانہ محو کرتا ہے گناہ شرمندہ مگر رہتے ہیں اس دہر سے ہم

اعلیٰ ادنیٰ کا ایک تو ہے مامن اور حسن سے تیرے ہے یہ سب ناز زمن
آب و رنگ رخ زمیں ہے تجھ سے ہے نور سے تیرے بزم انجمن روشن

مال و دولت کی حرص دنیا کو ہے ہر کس کو تلاش دلبر دلجو ہے
ہر دل کو رہا کرتا ہے اک چیز کا شوق ہم کو دل آگاہ کی جستجو ہے

تخم غفلت جہاں کے گلشن میں نہ بو اور کشت گناہ کا مزارع بھی نہ ہو
اللہ سے گر شرم نہ کی اے باقیؔ مخلوق ہی کے سامنے باشرم رہو

○

بے لشکر و فوج پادشائی ہے ہمیں / مفلوکی میں ناز کبریائی ہے ہمیں
بے شبہہ بدولت فقیری باقیؔ / در پردہ بندگی خدائی ہے ہمیں

شادی کبھی دل میں غم کبھی چھایا ہے / باقیؔ نے بدولت اس کے سب پایا ہے
بھولا تھا راہ آپ میں وہ کب تھا / اس راہ نما نے آپ میں لایا ہے

ہم زلف کی صورت ہیں پریشاں اپنے / ہیں غنچہ روش سر بگریباں اپنے
جب سے کہ ہوا ہے ہم میں وہ جلوہ فزا / آئینہ صفت ہیں آپ حیراں اپنے

یارب ہے وجود تیرا ہرجا موجود / واصل نے کسی کو نہیں سمجھا موجود
ہے مادہ تیرا علت لیجاد صور / صورت میں نہیں ہے جز ہیولا موجود

ہرچند کہ صاف ہوں کدورت سے مگر / ہوں محو لے میری پریشاں ہے نظر
خلقت کدہء دہر میں آئینہ کی شکل / گو آنکھ کھلی ہے کچھ نہیں ہم کو خبر

باقیؔ افکار زندگانی سے گزر / اور حرص و ہوائے کامرانی سے گزر
پہلے ہی تو درگزر وہ اندیشہ کو / کرتا ہے جو اس جہان فانی سے گزر

○

اے شیخ نہ کر ہم سے کرامات کی بات اخبار پریشان و خیالات کی بات
منظور اگر بیہودہ گوئی ہے تجھے باتیں ہیں بہت نہ کر خرافات کی بات

وحدت مرا سامان بہار دل ہے بیخود ہوں کہاں حب وطن حائل ہے
اس باغ جہاں میں خوشۂ تاک کی طرح خود شیشہ ہے خود بادہ ہے خود محفل ہے

باقیؔ جو ہے خواستگار اہل عرفاں ملتا ہے کلام ہی سے بس اس کا نشاں
ہم کو گر ڈھونڈتا ہے تصنیف میں ڈھونڈھ معنی کی طرح کتاب میں ہیں پنہاں

باقیؔ تجھ کو نہ ہم نشیں سے ہے کام کچھ دور سے مطلب نہ قریں سے ہے کام
اس کلبہ میں بیٹھا ہے تو بس اب تجھکو چشم و دل و اشک و آستیں سے ہے کام

بار ہستی سے ہو سبکدوش کہیں جز تہمت نام اور حاصل ہی نہیں
باقیؔ اب کیا ضرور رہنا تجھکو بیٹھا ہے نقش اٹھ تو مانند نگیں

حاصل تری زندگی کا آخر مرنا کب تک ہو حیات بے وفا پر مرنا
اے باقیؔ خود پرست مردی ہے یہی پہلے مرنے سے ہو سکے گر مرنا

○

ہے خون جگر ابھی تو پینا باقی
ہے جامہء حیات اب بھی سینا باقی
اس کشمکش ہست سے کیا ہوگی نجات
مرتے ہیں کہاں ابھی ہے جینا باقی

اس درد کے درد کو نہ پہنچا کوئی
اس کے دم سرد کو نہ پہونچا کوئی
پہونچاتی ہے یاس اس کے دل کو اس جا
اس جائے کے گرد کو نہ پہنچا کوئی

دولت مجھے چاہیے نہ کچھ فوج و سپاہ
ہے قطع تعلق ہی میری حشمت و جاہ
بہتر اسباب سے ہے ترک اسباب
اس دولت فقر سے گدا ہوتے ہیں شاہ

ہرگز میں نہیں عطائے شہ کا محتاج
دل میرا نہیں فوج و سپہ کا محتاج
صاحب نظر ایکدم توجہ جو کرے
آئینہ صفت ہوں اک نگہہ کا محتاج

کرتا ہے تلف عمر کو کیوں اپنی ہرآن
صحبت میں فقیروں کے عبث اے نادان
جو عالم غیب میں ہے سب ہے تجھ میں
اے مخزن اسرار الٰہی پہچان

کی خوب معاش کامرانی ہم نے
بے فکر معاد زندگانی ہم نے
دشمن بھی کبھی نہ کرسکے گا باقی
اپنے پہ جو کی ہے مہربانی ہم نے

○

ہر سمت سے جو صوت و صدا سنتا ہوں   آہنگ ترا نام خدا سنتا ہوں
جو دیکھتا ہوں مد نظر ہے تو ہی   جو سنتا ہوں بس نام ترا سنتا ہوں

الجھن حیرت نے گفتگو میں ڈالی   یاس آئی تو خاک آرزو میں ڈالی
افسوس یہہ نارسائی برق و شرار   آتش دل و جان جستجو میں ڈالی

حاصل ہے پختگی میں سودائے خام   آزادی ہی ہے ہمارے حق میں اک دام
یعنے باقی جہاں میں عنقا کی مثال   گم ہو کے کیا ہے ہم نے پیدا یہہ نام

ہر گوشہ میں اک شور بیاباں ہے یہاں   ہر غنچہ کی مٹھی میں گلستاں ہے یہاں
عقدہ دل کا کھلے تو کچھ آئے نظر   ہر قطرہ کی جیب میں ہی طوفاں ہے یہاں

یہہ علم ہی سب چیز کو بتلاتا ہے   ہر عقدۂ مشکل اس سے کھل جاتا ہے
تصنیف نیک کے سوا کیا ہے کام   جو کام کے بعد سب کے کام آتا ہے

میں قطرہ آب ہوں کہ باقی در ہوں   اس عجز و تفاخر کا میں کب در خور ہوں
محتاج ہے کون ، کیا ہے محتاج اللہ   پیمانہ ہوں اپنی عمر کا میں خود پر ہوں

○

غزلیات

بس آتے ہیں اب روٹھ کے جانا نہیں اچھا
جانا نہیں اچھا ہے یہہ جانا نہیں اچھا

پازیب کی آواز سنانا نہیں اچھا
سوتے ہوئے فتنوں کو جگانا نہیں اچھا

اب غیر پشیمان ہوئے جان گنوا کر
ہم کہتے نہ تھے دل کا لگانا نہیں اچھا

باتوں میں بگڑ جاتے ہو کچھ خیر ہے صاحب
اتنا بھی تو بد ذاتی پر آنا نہیں اچھا

کیا قدر تمہاری کوئی باقیؔ کرے افسوس
تم اچھے ہو لیکن یہہ زمانہ نہیں اچھا

غزلیات کا انتخاب "حضرت باقیؔ کے دیوان" بقائے باقی" سے کیا گیا ہے۔ دیوان بقائے باقی ۱۸۹۰ء میں ملک الشعراء دوارکا پرشاد افق لکھنوی نے لکھنو سے طبع کروایا۔

○

میں سوئے گلشن فردوس گزر کیا کرتا
بے رخ یار رخ گل پہ نظر کیا کرتا

دیکھتے تم کہ شرارت سے یہہ شر کیا کرتا
گر اجل سر پہ نہ ہوتی تو بشر کیا کرتا

مہر تاباں کو نہیں جسکی حضوری سے فروغ
ہمسری اس رخ روشن سے قمر کیا کرتا

جان جاں ہمت عاشق پہ نہ کر طعنہ زنی
دل تجھے دے چکا اب اور جگر کیا کرتا

آپ نے لطف سے آنسو جو نہ پونچھے ہوتے
دیکھتے پھر یہہ میرا دیدہ تر کیا کرتا

حاصل زیست ابھی تک نہیں معلوم ہوا
پی کے میں آب بقا مثل خضر کیا کرتا

بہ خدا میں ہوں جواں بخت سنو اہل وطن
فلک پیر مرے ساتھ سفر کیا کرتا

جیتے جی جس نے ملاقات نہ کی اے باقی
میری تربت پہ زیارت کو گزر کیا کرتا

○

بس کہ ہے دل میں تمنائے شراب
دل ہے پہلو میں کہ مینائے شراب

بط جو ہر دور میں اڑتی ہے یوں
جان دیتا ہے مسیحائے شراب

بات میں پیر جواں ہوتا ہے
زاہد آ دیکھ تماشائے شراب

باغ میں لطف ہے مےَ نوشی کا
جام گل سرو ہے مینائے شراب

بادہ کش وہ ہیں کہ صندل کے عوض
درد سر ہے تو لین لائے شراب

کیوں نہ ملاح ہو ساقی باقیؔ
جام ہے کشتی دریائے شراب

○

دور ہے آنکھ سے جو وہ چوکھٹ
در مژگاں کے یاں کھلے ہیں پٹ

ٹکڑے ٹکڑے جگر ہے مثل کتان
گھونگھٹ اس ماہ کا گیا جو الٹ

پتلیاں بھرتی رہتی ہیں آنسو
میری آنکھیں ہیں یا کہ ہے پنگھٹ

ٹھوکریں مارتا ہوں وحشت میں
ڈر ہے دامان کوہ جائے نہ پھٹ

جس سے کرتا ہے تو تیمم شیخ
خاک وہ میرے مئے کی ہے تلچھٹ

ٹھنڈی سانسیں میں دل سے لیتا ہوں
یاد آتی ہے جب وہ گرماہٹ

ٹھگ ہیں زاہد نہیں ہیں اے باقیؔ
ان سے بڑھ کر نہیں کوئی نٹ کھٹ

○

کہہ رہا ہے دل شیدائے شراب ہائے خم ہائے سبو ہائے شراب
کہو ساقی سے ادھر لائے شراب گر نہ صہبا ہوتو وے لائے شراب
عاشق پیرمغاں کی مٹی خاک میں مل کے بنی لائے شراب

○

کیا سیر دیدنی ہے رستوں میں میکدے کے
گرتے ہیں کس مزے سے میخوار چلتے چلتے

اس دم کا کیا بھروسہ آخر اسے فنا ہے
ہوجائیگی گھڑی بند اک بار چلتے چلتے

کچھ مجھ میں تجھ میں دوری ایسی ہوئی کہ قاصد
خط کے لئے ہوئے ہیں بیزار چلتے چلتے

بندہ تو آپ کے گھر سو بار آچکا ہے
میرے بھی گھر تو چلئے اک بار چلتے چلتے

اک شے پسند خاطر اپنے تو یاں نہ آئی
باقی جہاں کا دیکھا بازار چلتے چلتے

بدلی ہمارے نالے کو سن کر دہل گئی
بجلی شرار آہ کی حسرت سے جل گئی
ابرو سے نوک سرمہ جو باہر نکل گئی
تیغ اجل نیام سے قاتل اگل گئی
آکر بلائے حشر مرے سر سے ٹل گئی
پر شام ہجر کی نہ ابھی ایک پل گئی
بدلا جو گھر کسی نے نہ پہچانا پھر اسے
تیرے مریض غم کی یہہ صورت بدل گئی
اے باغباں نہ کر زر گل پر عبث غرور
دو دن کی ہے بہار جو آج آئی کل گئی
ہوں زلف و رخ کے عشق میں مہمان صبح و شام
دن کاٹنا محال ہے گر رات ٹل گئی
آئے تمھیں نہ آئی قضا میری رات کو
نکلے نہ گھر سے تم نہ مری جاں نکل گئی
اب تذکروں سے عہد جوانی کے فائدہ
وہ دن گئے وہ بات گئی وہ چہل گئی
رویا تو دلگی کے لئے مشغلہ ہوا
نالے کبھی کئے تو طبیعت بہل گئی
فیضان فیضؔ سے ہوئی باقیؔ دکن کی قدر
جب لکھنو کو لکھ کے ہماری غزل گئی

○

یہہ کس آشوب جاں کی رہ گزر ہے
کہ ہر نقش قدم ایک چشم تر ہے

مجھے اشکوں سے رسوائی کا ڈر ہے
مثل ہے گھر کے بھیدی سے خطر ہے

نہ کیوں جامے سے ہوجاؤں میں باہر
کہ آج اس بت کے آنے کی خبر ہے

حباب آسا ہے اپنا دم لبوں پر
کوئی دم میں ادھر ہے یا ادھر ہے

جگر کو کررہی ہے تیغ زخمی
نہیں معلوم یہہ کس کی نظر ہے

جناب میرؔ کا پیرو ہوں باقیؔ
میرے شعر و سخن میں کیا اثر ہے

○

جوش گریہ سے زمانے کی ہوا بدلی ہے
شرط اے دیدہ تر ابر سے کیا بدلی ہے

آنکھ وہاں نکلی یہاں جان بھی نکلی اپنی
نگہہ یار نہیں بدلی قضا بدلی ہے

نقد دل لے کے بدلتا ہے وہ ہو کیا تدبیر
میری تقدیر ہی اے بار خدا بدلی ہے

اس جفا کار سے تب کی ہے محبت میں نے
پہلے سو مرتبہ جب شرط وفا بدلی ہے

دور مئے ہے نئے انداز سے لازم اسوقت
کیا گھٹا چھائی ہے کیا ابر ہے کیا بدلی ہے

ایک گل میں بھی نہیں بوے وفا اے باقیؔ
ان دنوں گلشن عالم کی ہوا بدلی ہے

○

دوست سے دشمنی یہہ کیا اے دوست
مجھ وفا دوست پر جفا اے دوست

تنگ ہے اور عرصہء عالم
تیرا کوچہ ہے دل کشا اے دوست

ترک مردم شکار ہیں واللہ
تیری آنکھیں ہیں کیا بلا اے دوست

ہم سے نفرت ہے دشمنوں سے ربط
ہوے بیگانے آشنا اے دوست

افسر و تخت کیا کرے باقیؔ
تیرے کوچہ کا ہے گدا اے دوست

○

عشق بازوں سے کیا برابر ہو جلتی ہے سرکٹاتی ہے گو شمع
کیسا اندھیر ہے خدا کی پناہ اس کے رخ کو کہیں سخن گو شمع
کاٹ کے سر یہہ مجھ سے کہتے ہیں کیسی جلتی ہے دیکھئے تو شمع

عاشق کامل اس کو کہتے ہیں
سرکٹا کر کھڑی ہے دیکھو شمع

○

ذکر ہجراں میں جو میں نے اوسے لکھا کاغذ
نہ تو قاصدؔ سے ملا اور نہ دیکھا کاغذ

خون کرنا جو نہ تھا آروزوں کا میری
سرخ کیوں مجھ کو پھر اس شوخ نے بھیجا کاغذ

سرخ دامن جو ہے قاتل کا قیامت کے دن
وہی محضر ہے وہی ہے مرے خوں کا کاغذ

خوف باقیؔ تجھے عصیاں سے ہے کیوں وہ ہے رحیم
بے خطر ہونے دے اعمال کا کالا کاغذ

○

پیغام زبانی بھی نہ بھیجا خط بھیجتے ہیں مجھے کہاں آپ
پائی نہ کبھی حقیقت اپنی اپنی نظروں سے ہوں نہاں آپ

پاس اے باقیؔ ہے کیا جو دیں نذر
حاضر ہے لیں جو نقد جاں آپ

○

وہ بت ہے در خورمی باز ہے ہر اک کام اپنا خدا ساز ہے
نہیں کوئی فرقت میں اپنا رفیق مگر ایک نالہ تو دمساز ہے
سنے میرے نالے نہ پوچھے کبھی کہ یہہ کون ہے کس کی آواز ہے
نگاہوں میں کرتے ہو جادو گری تری چشم فتان فسوں ساز ہے
زباں منہ میں جلتی ہے مانند شمع کہوں کس طرح عشق کا راز ہے
میں مجبور الفت وہ مغرور حسن ادھر ہے نیاز اور ادھر ناز ہے
اذیت ہی پائی خدا کی قسم بتوں کا مجھے عشق ناساز ہے

جفا کرکے دل کو نہ میرے دکھا
کہ باقیؔ ترا ایک جاں باز ہے

○

سب سمجھتے اور ہیں حالت ہماری اور ہے
اور بیماری ہے کچھ بیمار داری اور ہے

عالم ہستی میں کیا دم لے بشر اے ہمدمو
آگے اس رہ رو کو منزل اس سے بھاری اور ہے

زخم ظاہر پر لگا مرہم تو اس سے فائدہ
پہلوئے دل میں نہاں اک زخم کاری اور ہے

تیرے متعاقب چلی آتی ہے گلشن میں خزاں
دو ہی دن میں رنگ اے ابر بہاری اور ہے

اک غزل انداز پر ناسخؔ کے اے باقیؔ لکھو
قافیہ اچھے ہیں گر مرضی تمہاری اور ہے

مہر سے ذرہ ہو اے باقیؔ مقابل کس طرح
شاعری ہے اور ناسخؔ کی تمہاری اور ہے

ہم شمع رخوں کا کبھی شکوہ نہیں کرتے
پروانہ صفت جلتے ہیں پروا نہیں کرتے
کیوں آئینہ دل کو مصفا نہیں کرتے
کیوں یار کو اپنے ہی میں دیکھا نہیں کرتے
خاطر شکنی اہل وفا کی نہیں اچھی
وہ ہم کو برا کہتے ہیں اچھا نہیں کرتے
دنیا ہی کی تشویش میں رہنا ہے شب و روز
انساں کو کچھ اس واسطے پیدا نہیں کرتے
قرباں تو میں ہونے کے لئے لیس کھڑا ہوں
کیوں تیر کا آپ اپنے نشانہ نہیں کرتے
بھرتا ہے کوئی نالہ تو کرتا ہے کوئی آہ
عاشق غم معشوق میں کیا کیا نہیں کرتے
اک نور کا بکا ہے ترا حسن جہاں سوز
موسیٰ تیرے دیدار کا دعویٰ نہیں کرتے
طاق خم ابروئے صنم پیش نظر ہے
ہم سہو سے کعبہ میں بھی سجدہ نہیں کرتے
ہر چند کہ جاتے ہیں بہت دور یہہ نالے
فریاد کو کچھ کام ہمارا نہیں کرتے
باقی ہوا اے جان تمہارے لئے فانی
یاد اس کی کبھی کرتے ہو تم یا نہیں کرتے

○

یوں کہا میری جب سنا مطلب تیرے مطلب سے مجھ کو کیا مطلب
اے پری مجھ سے تجھ سے کیا ہو نباہ تو جفا کار میں وفا مطلب
جب کہا میں نے غیر آتا ہے کیوں وہ یہہ بولا کہ تجھ سے کیا مطلب

دل میں میرے بھرے ہیں اے باقیؔ
آرزو شوق ، مدعا ، مطلب

○

اے بت خدانے دی ہے تجھے وہ ستم کمر
محبوب اور ہیں مگر ایسی ہے کم کمر

جھکتے ہیں کب کسی کی وہ تعظیم کے لئے
بارگران زلف سے ہوتی ہے خم کمر

ہیں جیتے مرتے عشق میں ان کی تمام لوگ
راہ بقا جو لب ہیں تو راہ عدم کمر

کیونکر کہوں میں سرو چمن کو قدنگار
اوسکا ہے ہم شبیہ نہ ہمسر نہ ہم کمر

فہرست تصانیف گردھاری پرشاد باقیؔ

(ا) فارسی نظم :-

(١) پیرایہ عروض ۔ منظوم فارسی قواعد ۔ ١٨٨٦ء میں طبع ہوئی اور بہت مشہور ہوئی ۔

(٢) کلیات یادگار باقیؔ ۔ فارسی غزلیات کا دیوان ١٨٩٠ء میں طبع ہوئی ۔

(٣) قصائد باقیؔ ۔ فارسی قصیدوں کا مجموعہ ١٨٨٢ء میں طبع ہوا ۔ پرودگار عالم کی شان اور حضرت محمدؐ کی شان میں لکھے گئے ۔

(٤) بہار عام ۔ باغ عام حیدر آباد کی تعمیر پر مثنوی ۔

(٥) مثنوی صدائع بدائع ۔ نواب سالار جنگ اول کی سوانح عمری (منظوم)

(٦) پرنس نامہ ۔ پرنس آف ویلز کے ہندوستان کے سفر کے موقع پر لکھی گئی ۔

(٧) تبنیات باقیؔ ۔ انسانی کردار اور چال چلن کے رویے پر لکھی گئی ۔

(٨) ضرب الامثال ۔ ١٨٨٥ء میں شائع ہوئی ۔ فارسی کی ضرب الامثال پر لکھی گئی ہے ۔

(٩) مکتوبات منظومہ :- باقیؔ نے ہمعصر شاعروں اور ادیبوں کو جو منظوم خطوط لکھے اور ان کے جوابات کا مجموعہ

(١٠) زمزمہ، باقیؔ ۔ مجموعہ کلام جس میں بارش، مختلف موسم اور تہواروں کی تفصیل بیان کی گئی ہے ۔

(١١) بھاگوت شریف : شریمد بھاگوت کا فارسی ترجمہ ١٨٨٩ء میں طبع ہوئی ۔

(١٢) رباعیات بابرکات :- اسماء حسنیٰ کی فضیلت اور برکت کا منظوم مجموعہ ١٨٩٢ء میں طبع ہوا ۔

(١٣) رباعیات مناجات باران رحمت : ٧٨-١٨٧٧ء میں حیدر آباد میں قحط پڑا ۔ رباعیات مناجات لکھکر باقیؔ نے سالار جنگ اول کو دی تھیں ۔ ان کی مناجات

پڑھنے پر بارش ہوئی ۔

(۱۴) آئینہ سخن

(۱۵) باغ رزاق :۔۱۸۹۶ء میں طبع ہوئی ۔اس میں اشیاء خوردنی کی خصوصیات فارسی نظم میں بیان کی گئی ہیں ۔

(۱۶) مثنوی شمع منور ۔ بھاسکر آنند سوامی کی شان میں لکھی گئی ہے ۔ ۱۸۹۴ء میں طبع ہوئی ۔

(۱۷) منشیات باقؔی ۔1885ء میں شائع ہوئی ۔اس میں سارے سلاطین آصفجاہی کی تخت نشینی کے تعلق سے بیان ہے اور ان کے دور کے اہم واقعات کا تذکرہ

(۱۸) کنوز التواریخ ۔1882ء میں شائع ہوئی ۔ باقؔی ، پیدائش جشن ، وفات ، تعمیر بلڈنگ وغیرہ کے سلسلے میں تاریخ نکالنے کے فن میں ماہر تھے ۔یہہ ان کی تاریخوں کا مجموعہ ہے ۔

(۱۹) کلام متفرقات ۔

(۲۰) کیشو نامہ ۔ بھگوان کیشو سوامی کی شان میں اور کیشو گیری کے دیول کا منظوم تذکرہ

(II) فارسی نثر۔ (۱) افضل التصحیح ۔ فارسی لغت طبع ہوئی ۔ (۲) توشہ عاقبت ۔سفرنامے ۔(غیر طبع شدہ)

(III) اردو:۔ (۱) تحقیقات سیاق باقؔی ۔علم ریاضی کی پہلیاں بیان کی ہیں ۱۸۸۶ء میں شائع ہوئی ۔ (۲) بقائی باقی اردو دیوان ۱۸۹۰ء میں طبع ہوا ۔ (۳) درد باقؔی درد ساقی ۔خواجہ میردرد کی فارسی رباعیات کا اردو منظوم ترجمہ ۱۹۲۲ء میں طبع ہوا ۔ (۴) باقؔی نامہ ۔ منظوم اردو کلام

(IV) ہندی (۱) تیرتھ مال ۔ بھجنوں کا مجموعہ (۲) شمبھو پران ۔ سنسکرت کی شیوپران کا خلاصہ ہندی نظم میں (۳) بھاگوت سار شہمد بھاگوت کا منظوم خلاصہ (۴) کیشو پران ۔وامن پران کا خلاصہ ہندی نظم میں ۔

کتابیات ۔ اردو

۱۔ خطوط و دعوت نامے بہ نام گردھاری پرشاد
۲۔ معروضہ گردھاری پرشاد بخدمت میر محبوب علی خاں
۳۔ میر محبوب علی خان کے خطوط بنسی راجہ کے نام

اخبارات

۱۔ روزنامہ سیاست اگسٹ ۱۹۶۵ء
۲۔ روزنامہ سیاست اگسٹ ۱۹۶۷ء
۳۔ روزنامہ سیاست جنوری ۱۹۹۰ء

رسالہ جات

۱۔ رسالہ نورس غزل نمبر شمارہ ۶ ۱۹۵۸ء
اکبرالدین صدیقی
تمکین کاظمی

کتب

۱۔ افسر الملک ۔ سوانح افسری نظام المطبع حیدر آباد ۱۹۰۱ء
۲۔ بشویشور پرشاد منوّر لمعات افق کوہ نور پرنٹنگ پریس دہلی ۱۹۶۴ء
۳۔ سری پرشاد راجہ احقر آخرت باقی اصح المطابع لکھنو ۱۸۹۶ء
۴۔ سید محی الدین قادری زور (ڈاکٹر) مرقع سخن ادب جلد اول آعظم اسٹیم پریس حیدر آباد ۱۹۳۵ء
۵۔ سید محی الدین قادری زور (ڈاکٹر) داستان ادب طارق ترقی پریس حیدر آباد ۱۹۵۱ء

۶۔ شیلا راج ڈاکٹر۔ مترجم توشہ عاقبت (اردو) ہندوستان پرنٹرس بمبئی ۱۹۸۴ء
۷۔ شیلا راج ڈاکٹر۔ مترجم شاہی شادی۔ سرور پرنٹنگ پریس حیدرآباد ۱۹۹۱ء
۸۔ مانک راو وٹھل راؤ بوستان آصفیہ جلد اول و دوم مطبع انوار اسلام حیدرآباد ۱۹۰۷ء
۹۔ نرسنگ راج عالیؔ راجہ۔ درد باقیؔ درد ساقی سردار پریس، حیدرآباد ۱۹۲۲ء
۱۰۔ نرہراج ساقیؔ۔ گلہائے صد رنگ انجمن ترقی اردو کریم نگر۔ کریم نگر ۱۹۶۴ء
۱۱۔ عابد انصاری۔ مترجم باغ رزاق اعجاز پرنٹنگ پریس حیدرآباد ۱۹۸۳ء
۱۲۔ عبدالحی محمد۔ مملکت آصفیہ جلد اول و دوم ناشر ادارہ محبان دکن کراچی پاکستان ۱۹۷۸ء
۱۳۔ عسکری مرزا محمد (مترجم) تاریخ ادب اردو ناشر خاتون مشرق اردو بازار دہلی بار اول ۱۹۶۶ء
۱۴۔ غلام صمدانی خاں گوہر۔ تزک محبوبہ جلد اول و دوم فخر نظامی پریس حیدرآباد ۱۹۰۱ء
۱۵۔ ہاشمی نصرالدین۔ دکن میں اردو۔ نسیم بک ڈپو لکھنو ۱۹۶۲ء
۱۶۔ ہاشمی نصیرالدین۔ شہر حیدرآباد عہد قطب شاہی، آصفیہ اور دور حاضر کے تمدن آثار ثقافت ناشر ادبی ٹرسٹ حیدرآباد ۱۹۷۸ء
۱۷۔ دوار کا پرشاد افقؔ۔ دیباچہ، دیوان بقائے باقیؔ۔ مطبع نظم اخبار موسومہ لکھنو پریس لکھنو ۱۸۹۰ء
۱۸۔ حبیب الرحمٰن صابری مفتاح القیوم ترقی اردو بورڈ دہلی

فارسی

۱۔ گردھاری پرشاد باقیؔ راجہ فارسی خطوط
۲۔ گردھاری پرشاد باقیؔ راجہ توشہ، عاقبت (سفرنامے)

۳۔ زائچہ میر محبوب علی خاں نوشتہ راجہ گردھاری پرشاد باقیؔ

کتب

۱۔ انبا پرشاد حکمؔ دیوان حکمؔ مطبع نظم اخبار موسومہ لکھنو پریس لکھنو ۱۸۹۱ء
۲۔ بچولال تمکینؔ دیوان نگارستان مطبع مرغوب دکن حیدرآباد ۱۸۸۴ء
۳۔ دوارکا پرشاد افقؔ حیات باقیؔ منظوم مطبع نظم اخبار موسومہ لکھنو پریس لکھنو ۱۸۹۰ء
۴۔ گردھاری پرشاد باقیؔ راجہ کلام متفرقات مطبع خیر خواہ دکن حیدرآباد ۱۸۸۶ء

ہندی

گردھاری پرشاد۔ گردھاری۔ کیشوپران۔ بھارتیہ جیون پریس کاشی سمت ۱۸۵۳ء
شمبھوپران (غیر مطبوعہ)
توشہ عاقبت۔ ہندی بھجن (غیر مطبوعہ)
بھاگوت سار۔ مطبع نظم اخبار موسومہ لکھنو پریس لکھنو ۱۸۹۰ء

News Papers

English : -

(1) Deccan Chronicle October 1981

(2) Indian Express September 1986

Confidential papers relating to Hyderabad.
(Hyderabad Residency Records)

* * *

1. NAI, Records of F D Secret Dec. 1879 N. 456. Kw with No. 6. the Hyderabad Reformed Troops and Arsenals - Page - 9.
2. NAI, FD. Confidential Memorandum C.No. 467-470.
3. NAI, FD. Confidential Memorandum by Maj Evan Smith First Assistant Resident, Hyderabad dated 10 August 1876. No. 476.
4. NAI, FD. Confidential Kw No. 5 Memorandum by Sir Richard Meade dated 15-10-1876. No. 476.

English Books.

1. Dave - J.H. Immortal India Vol I Bharaitya Vidya Bhavan Bombay 1951.
2. Embree, T.A.Ainslie - Sources of Indain Tradition Vol. I Second Edition Penguin Books.
3. Ghosh Aurobindo - The Foundation of Indian Culture The Sri Aurobindo Library Inc. New York.
4. Leonard Karen Isaksew - Social History of an Indain Caste. The Kayesths of Hyderabad, London, University of California 1978.
5. L-Prasad - Evolution of Indian Culture. Jainsons Printers Agra 1992
6. L-Prasad - History of India Rashtriya Art Printers Agra - 1992
7. Saksena - Ram Babu A History of Urdu Literature Ram Narain Lal Allahabad 1927.
8. Raj Sheela Dr. Medivalism to modernism Popular prakashan, Bombay 1987.
9. Ranganatha Nanda Swami "Our Cultural Heritage-Modern Orientation. Publication Division. Ministry of Information and Broad Casting Govt. of India New Delhi. Oct. 1987.
10. Sarver-Ul-mulk-"My Life" Arthur H. Stock Well Ltd London 1932.
11. UNESCO - The Story of Civilization Vol I. Our Heritage - Section on India UNESCO Publication.
12. Vivekananda Swami - The Complete Work Vol - 3 Advaitya Ashram Calcutta 19.

۲۳-۵-۱۳۰۱ ہجری

گردھاری پرشاد

جب مختار الملک مرحوم دیوان ہوئے تھے ناصر الدولہ مغفور کے وقت میں تو جواہر ملا تھا یا نہیں اور جب افضل الدولہ بہادر جلوس فرمائے تو سب امراء کو جلوس کی خوشی میں جواہر عنایت فرمائے تو کیا اس وقت میں پھر مکرر مختار الملک مرحوم کو جواہر عنایت فرمائے تھے یا نہیں اور اگر یہہ حساب لگاتے ہیں دیوانی کی وقت جو جواہر ملا کرتا ہے تو وہ دیوانی کے عہدہ کا ملا کرتا ہے اور جلوس کی خوشی کا الگ تو اب جلوس کی خوشی کا جواہر منیر الدولہ بہادر کو ملنا۔ اگر تم کو اس میں کچھ معلوم ہے یا تمھارے پاس کس کس وقت جواہر عنایت ہوا ہے مختار الملک مرحوم کو تو تم جلدی لکھکر میرے پاس بھجوانا تاکہ اوسکا جلد بندوبست کرنے میں آوے۔

یا محبوب

(دستخط محبوب علی پاشاہ)

(۲۳-۵-۱۳۰۱ ہجری)

مختار الملک۔ نواب سالار جنگ اول۔

منیر الدولہ بہادر۔ سالار جنگ دوم

راجہ گردھاگری پرشاد

جب میں قلعہ جاونگا تو انشاء اللہ تعالیٰ بچی کی سالگرہ وہیں کرونگا تم سب اسباب سالگرہ وہیں تیار کر کے محل میں داخل کرنا۔ سب بندوبست مہندی وغیرہ کا وہیں یعنے قلعہ میں کرنا اور بلکہ سب اسباب یعنے چوتھی اور گرہ اور جہاز وغیرہ کا بندوبست وہیں کرنا۔ اور گرہ ڈالنی چونکہ وہ میمنت ہے رسول یار خاں اونہی کو گرہ ڈالنے بلانا اور سب تمام شادی کے کام کی تیاری وہیں کرنا۔ انشاء اللہ تعالیٰ سب کام وہیں ہونگا۔

یا محبوب

دستخط محبوب علی پاشاہ